www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2022، قیمت :- ₹10

ماهنامه بچوں کی دنیا نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

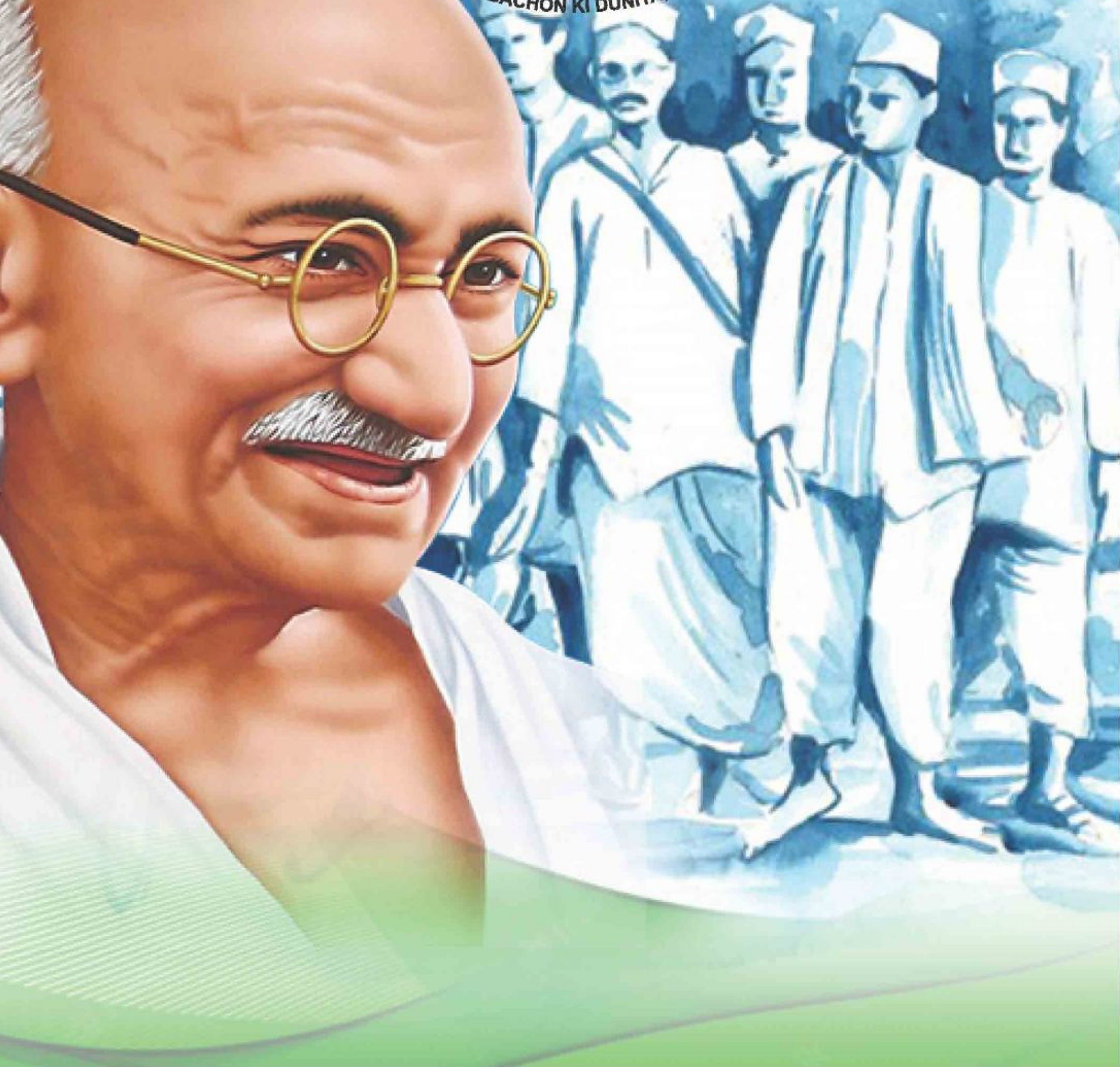

بچوں کے قلمکاروں کے لیے سوالنامہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں بچوں کے قلمکاروں سے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کو قلمکاروں اور کتابوں کے بارے میں معلومات کے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل اور کریئر بہتر بنانے کے لیے نئی روشنی اور نئی راہ بھی مل سکے۔
یہ ادارے کی طرف سے تیار کردہ سوالات ہیں، ان کے جوابات ادب اطفال سے جڑا ہوا کوئی بھی قلمکار دے سکتا ہے۔

1 بچپن کی کون سی باتیں/شوخیاں/شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟
2 بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنّفین کون تھے اور اب کون ہیں؟
3 بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟
4 بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھے؟
5 بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟
6 زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنّفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہو سکتی ہیں؟
7 مستقبل اور اپنے کریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا؟

---

8 اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟
9 آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟
10 آپ کی پہلی تخلیق، کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟
11 آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟
12 کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟
13 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
14 ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟
15 کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟
16 انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں؟
17 کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟
18 بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
19 معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
20 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟
21 بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے!
22 ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟
23 بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

* جوابات کے ساتھ پاسپورٹ سائز تصویر اپنی کتابوں کا عکس ضرور ارسال کریں۔

بچوں کی دنیا

جلد: 10 شمارہ: 10 اکتوبر 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم ۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000
شعبہ ادارت:11-49539009

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ/100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

’بچوں کی دنیا‘ کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی - 110066
فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد - 500002
فون: 040-24415194

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
مضامین		
ایک عظیم ہستی	پی ڈی ٹنڈن	06
بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی	رازدان شاہد	08
انٹرویو		
نئے قلمکار پیدا کرنے کی ضرورت ہے	عبدالودود انصاری	13
نظمیں		
نئی کونپل	متین اچل پوری	18
پیام شاعر	مناظر حسن شاہین	18
کمپیوٹر	شاہد جمیل	19
بلبل	رضاء الرحمن عاکف	20
اسکول جو ہوتا	ضیاء الرحمن جعفری	21
میں ایک انسان ہوتا	آزاد سونی پتی	22
عظمت والے پھول	امان الحق بالا پوری	22
دیپک	فراق جلال پوری	23
دوست کی امداد	شمیم انجم وارثی	23
بچوں کے بڑے ادیب		
بچوں کا باکمال شاعر : ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر	ایم نصر اللہ نصر	24
کہانیاں		
روٹیوں کا جلسہ	سلمیٰ حسین	26
دلجوئی	اقبال برکی	28
شرط	محمد طارق	31
ایک سے بھلے دس	عادل حیات	34
جنتر منتر کا کرشمہ	محمد مطیع اللہ نازش	36
تین پودے	خان حسنین عاقب	39
صبح کی بارش	فاضلہ الفت	42
چڑیا رانی اور بلّی	روبینہ ساگر	46
ڈراما		
بال سبھا	سید اسد تابش	48
بچوں کا کتب خانہ		
ڈیجیٹل جنگل/ ایم مبین	حمیرا عالیہ	52
سائنس نامہ		
موبائل فون اور دیگر الیکٹرانک آلات	جاوید احمد سعیدی کامٹوی	54
زبان شناسی		
کب (ن) کی آواز (م) سے بدل...	سید بدرالحسن	59
کہکشاں		
چمن چمن کے پھول		60
ننھے فنکار		
پینٹنگ		61

پیارے بچو! 2 اکتوبر 1869 کو ہندوستان کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی کی پیدائش پوربندر میں ہوئی، ان کا اصل نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا، ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے جہاں انھوں نے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی۔ حصول تعلیم کے بعد 1893 میں وہ جنوبی افریقہ چلے گئے، انھوں نے تقریباً بیس سال تک افریقہ میں ملازمت کی، اور وہاں نسلی امتیاز کے خلاف کھل کر اپنی آواز بلند کی، جس کی وجہ سے انھیں نو ماہ جیل میں بھی رہنا پڑا، لیکن انھوں نے ٹھان لیا تھا کہ یہاں سے نسلی امتیاز کو ختم کر کے ہی دم لیں گے، آخر انھیں کامیابی ملی اور اس وقت کی برطانوی حکومت کو ہندوستانیوں پر ہو رہے نسلی امتیاز کو ختم کرنا پڑا اور گاندھی جی کو جیل سے رہا کرنا پڑا۔ 1915 میں یہ اپنے ملک ہندوستان واپس آگئے۔

ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے مہاتما گاندھی نے ہر طرح کی قربانی دی۔ انھوں نے اس راز کو جان لیا تھا کہ عدم تشدد ہی وہ واحد راستہ ہے جس کے ذریعے ملک کو غلامی سے نجات دلایا جاسکتا ہے۔ آزادی کے لیے بہت سی تحریکیں چلائیں، جلسے کیے، ڈانڈی مارچ کیا، لیکن ایک بات یاد رکھیے کہ ان کی تمام کوششیں پرامن تھیں۔ بہت ہی سنجیدگی سے انھوں نے تحریکوں کی قیادت کی اور بالآخر ہندوستان انگریزوں کے قبضے سے آزاد ہو گیا، انھوں نے دنیا کو بتا دیا کہ پرامن احتجاج میں کتنی طاقت ہے۔ پیارے بچو! گاندھی جی نے نہایت سادہ زندگی گذاری۔ اگر وہ چاہتے تو عیش و آرام کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اپنے لیے مال و دولت جمع کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے سادگی کو اپنایا اور اپنی پوری توانائی ملک کی آزادی، ترقی اور خوش حالی کے لیے وقف کر دی، انھوں نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا، وہ چاہتے تھے کہ لوگ بھی سچائی کا ساتھ دیں اور جھوٹ سے پرہیز کریں، یہی وجہ ہے کہ وہ سچ بولنے والے کو بہت پسند کرتے تھے۔

پیارے بچو! آپ گاندھی جی کی سوانح کا ضرور مطالعہ کریں۔ انھوں نے عدم تشدد، سادگی اور سچائی پر جس قدر زور دیا ہے وہ واقعی قابل توجہ ہے، اسے آپ بھی اپنی زندگی میں اپنائیں، اس سے یقیناً آپ کی زندگی میں بہتری آئے گی، آپ ہمیشہ سچ اور سچائی کا ساتھ دیں، چاہے حالات جیسے بھی ہوں، سچ پر قائم رہیں، جھوٹ سے بچیں، نیک بنیں، غلط کام اور بری صحبت سے دور رہیں، اچھے دوست کا انتخاب کریں، مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ ”بچے ہماری قوم اور اس سرزمین کی جان ہیں، ہندوستان کا مستقبل انھیں کے ہاتھوں میں ہے“۔ اس لیے اپنے وقت کا صحیح استعمال کریں اور اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ کامیابی آپ کے قدم چومے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

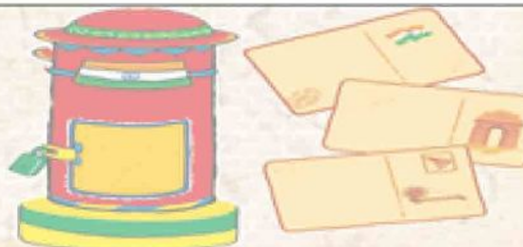

'بچوں کی دنیا' اگست 2022 نظر نواز ہوا۔ سرورق پر کیا ہی خوبصورت منظر پیش نظر ہے کہ لال قلعہ کے پیش منظر میں لہراتا ہوا ترنگا اور اوپر آسمان میں امن کی پیغامبر فاختائیں بانکپن سے فضاؤں میں اُڑانیں بھرتی ہوئیں اور آسمان کی بلندیوں کو چھونے کے لیے بے تاب ایک دوسرے سے بازی لے جاتی ہوئیں۔ جی چاہتا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیں، نہارتے ہی جائیں۔

یہ تو باہر کا سہانا منظر ہوا۔ اندر بھی وہی حال ہے۔ اندر تیس سے زائد مضامین یا نظمیں ہی نہیں۔ یوں سمجھیے کہ کسی لالہ زار میں تتلیاں اور چڑیاں اُڑ اُڑ کر بچوں کو تلاش کر رہی ہیں کہ آئیں اور ان سے خوبصورت میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہیں! کرتے رہیں! ہے نا؟

مصطفیٰ ندیم خاں غوری، بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' جولائی 2022 نظر نواز ہوا۔ میری کہانی 'مہا کنجوس' کی اشاعت کے لیے شکریہ! سابقہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی نہایت ہی خوبصورت، عمدہ، لاجواب اور دیدہ زیب ہے۔ 'بچوں کی دنیا' میں شامل تمام مواد عمدہ اور اعلیٰ معیار کا ہوتا ہے جو ہر طرح سے مزین ہے، 'بچوں کی دنیا' اردو زبان کا کثیر الاشاعت اور بہت ہی مقبول اور منفرد رسالہ ہے۔ ہماری تنظیم سردار حمیدی تعلیمی و سماجی مشن کی لائبریری میں قومی کونسل برائے فروغ اردو کے تینوں رسالے آرہے ہیں۔ میں بچوں کے والدین سے گذارش کروں گا کہ وہ 'بچوں کی دنیا' کے سالانہ خریدار بنیں یا خرید کر بچوں کو پڑھنے کو دیں۔

ڈاکٹر افتخار انیس (صدیقی) حمیدی، 196، چلہ امروہہ (یوپی)

ماؤنٹ سینا اکیڈمی گورکھپور یوپی درجہ دوم کے طلبہ 'بچوں کی دنیا' کا اجتماعی مطالعہ کرتے ہوئے

جب سے آپ نے 'بچوں کی دنیا' میں ادیبوں اور شاعروں کے تعارف نامے شائع کرنا شروع کیے ہیں اس کی مقبولیت اور محبوبیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ واقعی یہ ادبا اور شعرا کے لیے ایک طور کا اعزاز اور سند ہے۔ اس سے بڑے اور بچے دونوں ہی میں مطالعہ کی دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور مزید کچھ جاننے کا اشتیاق بھی۔ اس مختصر سے تعارف نامے میں قلم کارو ں کے تعلق سے بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ ان کی تخلیقات اور تصانیف کے بارے میں بھی جانکاری دے کر آپ بڑا نیک کام انجام دے رہے ہیں۔ اس تعلق سے تازہ شمارہ بھی خوب ہے۔ نیک خواہشات کے ساتھ!

فراق جلال پوری، محلّہ: قاضی پورہ، پوسٹ: جلال پور، ضلع امبیڈکر نگر (یوپی)

ایک عظیم ہستی
باپو

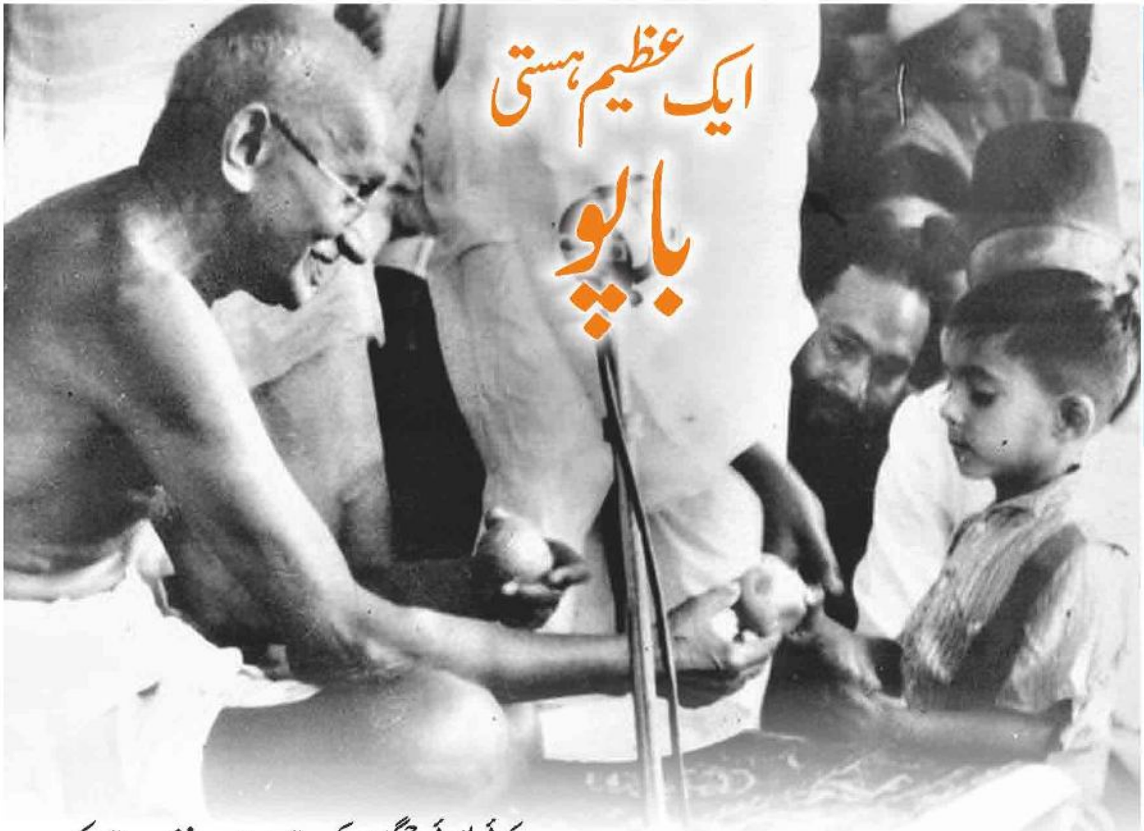

بچو! تمھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ باپو کے پاس کوئی فوج تھی نہ ہتھیار۔ پھر بھی انھوں نے انگریز سرکار کو کیسے شکست دے دی اور کیا وجہ ہے کہ اس ملک کے سب ہی رہنے والے ان کی اتنی عزت کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باپو کا کردار بہت بلند تھا۔ وہ دشمن سے بھی نفرت نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے ساتھ مکاری سے پیش آتے تھے۔ یہاں تک کہ جو ان کو ستاتا تھا وہ اسے بھی ستانا پسند نہیں کرتے تھے۔ جو کوئی ان سے نفرت کرتا تھا وہ اس کے ساتھ محبت اور مہربانی کرتے تھے۔ جو لوگ انھیں جیل بھیجتے تھے ان سے بھی باپو کوئی بیر نہیں رکھتے تھے۔ وہ دکھ درد جھیل کر دوسروں کا سدھار کرتے تھے۔ ان کے آشرم میں اگر کسی سے غلطی ہوجاتی تو معافی باپو مانگتے تھے۔ کوئی ان کی درست بات کو بھی سننے سے انکار کر دیتا تو وہ اس سے کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرتے نہ اس پر خفا ہوتے بلکہ برت رکھتے اور اس طرح اس کے جرم کی سزا بھگتتے اور عبادت کے بدلے بھگوان سے امید رکھتے تھے کہ وہ اچھا پھل دے گا۔ انھوں نے انگریز سرکار سے صحیح کام کرانے کے لیے کئی مرن برت رکھے۔ جب وہ برت رکھتے تو لوگ ان کی طرف سے فکرمند ہوجاتے کیونکہ سب جانتے تھے کہ باپو سچ کے لیے جان تک قربان کردیں گے۔ اس عظیم شخصیت کی موت کی ذمے داری نہ تو جنتا لے سکتی تھی نہ انگریز سرکار۔ چنانچہ ان کے برت کا اثر ہوتا تھا اس کی وجہ سے کئی بار انگریز سرکار نے ان کی کئی مانگیں مان لی تھیں۔ باپو لوگوں سے ایک انوکھا برتاؤ کرتے تھے۔ اسی لیے وہ اس دنیا میں انوکھے انسان تھے۔ جب ہندو مسلمان آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کو مارتے کاٹتے تھے تو باپو فوراً مرن برت رکھتے تھے یعنی اپنی بات منوانے کے لیے

اپنی جان پر کھیل جانے کو تیار ہو جاتے تھے۔ پھر ان ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہوش آتا تھا اور دنگے فساد سے توبہ کر لیتے تھے اور باپو سے برت ختم کرنے کی درخواست کرتے تھے۔ ہندوستان میں باپو کی بڑی شاندار حیثیت تھی۔ شاید صدیوں تک اس رتبے کا انسان اس ملک میں پیدا نہ ہو سکے۔

بہادر انسان

بچو! تمھیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ کچھ لوگ باپو کو دنیا کا سب سے بہادر انسان مانتے تھے۔ وہ موت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے، نہ انھیں روپے پیسے کا لالچ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ دنیا کی سب سے بڑی برائی خوف ہے، انھوں نے ہندوستانیوں کو خوف سے بچے رہنے کا مشورہ دیا، ڈاکٹر خان صاحب نے جو بڑے جیالے پٹھان تھے ایک مرتبہ اخبار والوں کو بتایا:

''میں گاندھی جی کی عزت کرتا ہوں اس لیے کہ وہ بہادر اور نڈر آدمی ہیں۔''

پٹھان لوگ اہنسا (عدم تشدد) کو سرے سے نہیں جانتے۔ ان کے لیے یہ ایک انوکھی بات ہے لیکن یہ باپو کا کرشمہ تھا کہ ان لوگوں کو بھی دھیرے دھیرے اہنسا کا سبق سکھا دیا۔ باپو کا یہ یقین تھا کہ اہنسا کی مدد سے اس دنیا کا ہر کام چل سکتا ہے اور ہنسا یعنی تشدد سے تو کسی بھی مسئلے کو سچے طریقے سے حل نہیں کیا جا سکتا۔

پیار ہی پیار

باپو بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی پرورش اچھی طرح کی جائے اور ان کی صحت درست رہے۔ انھیں اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ یہ بچے ہی آنے والے زمانے کا اجالا اور طاقت ہیں۔ اگر انھوں نے اچھی طرح تعلیم حاصل نہ کی اور ان کی صحت اچھی نہ ہوئی تو دیس آگے کیسے بڑھے گا۔ اسی خیال سے انھوں نے بچوں کے لیے بنیادی تعلیم کی اسکیم پیش کی۔ وہ چاہتے تھے بچوں کو سچی اور اچھی تعلیم دی جائے۔ وہ اچھی طرح پڑھیں اور سب کچھ جانیں۔ باپو سادھوؤں اور درویشوں کے سے خیالات رکھتے تھے۔ اسی لیے لوگ ان کو مہاتما کہتے تھے۔ وہ اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے جیتے تھے۔ ان کے بھید وہی جانیں۔

باپو ہر بات کو سمجھتے اور ڈھنگ سے سلجھانے کی کوشش کرتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان کی بڑائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک بار سیوا گرام میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ گاندھی جی کے سامنے قلم دوات رکھا تھا۔ اسی بیچ آشرم کے دو بچے کھیلتے کھیلتے وہاں آ گئے اور آتے ہی قلم دوات اٹھا لیا اور چل دیے۔ باپو نے انھیں ڈانٹا نہیں کیونکہ ان کو غصہ تو کسی بات پر آتا ہی نہ تھا، وہ اٹھے اور ان کے پیچھے چل دیے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان بچوں کو سمجھا بجھا کر قلم دوات لے لیں۔ اس میں ان کا خاصا وقت لگ گیا، کمیٹی کے کئی ممبروں نے اس کو برا مانا اور سردار پٹیل نے باپو سے کہا:

''آپ نے ان بچوں کو ڈانٹا نہیں کہ انھوں نے ایک ضروری کام میں رکاوٹ کیوں ڈالی۔''

گاندھی جی نے جواب دیا:

''تم میری جگہ ہوتے تو ضرور ڈانٹتے بلکہ مار پیٹ بھی کرتے۔ میں ان کو کس طرح ڈانٹتا۔ آخر یہ ہم سے بھی بڑے بنیں گے۔''

کسی میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں رہی اور بات ٹل گئی۔

■

ماخذ: باپو اور بچے، **مصنف:** پی ڈی ٹنڈن، **پانچویں طباعت:** 2011، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

رازدان شاھد

بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی تاریخ کے آئینے میں

بھارت کے سیاسی اور روحانی رہنما اور آزادی کی تحریک کے اہم ترین کردار مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ اور اہنسا (عدم تشدد) کو اپنا ہتھیار بنایا۔ ستیہ گرہ، ظلم کے خلاف عوامی سطح پر منظّم سول نافرمانی ہے جو عدم تشدد پر مبنی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کی وجہ بنی اور ساری دنیا کے لیے حقوق انسانی اور آزادی کی تحریکوں کے لیے روح رواں ثابت ہوئی۔ بھارت میں انھیں احترام سے مہاتما گاندھی اور باپو کہا جاتا ہے۔ بھارت میں وہ بابائے قوم (راشٹر پتا) کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ گاندھی جی کا یوم پیدائش (گاندھی جینتی) بھارت میں قومی تعطیل کا درجہ رکھتا ہے اور دنیا بھر میں یوم عدم تشدد کے طور پر منایا جاتا ہے۔ عدم تشدد کے پیشوا کے طور پر، گاندھی نے سچ بولنے کی قسم کھائی تھی اور دوسروں سے بھی ایسا ہی کرنے کی وکالت کی۔ وہ سابرمتی آشرم میں رہتے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لباس کے طور پر روایتی ہندوستانی دھوتی اور شال کا استعمال کرتے، جو وہ خود سے چرخے پر بُنتے تھے۔ وہ سادہ اور سبز کھانا کھاتے اور روحانی پاکیزگی اور سماجی احتجاج کے لیے لمبے اُپواس (روزے) رکھا کرتے تھے۔

1869: موہن داس کرم چند گاندھی صوبہ گجرات کے 'پوربندر' میں 2 اکتوبر 1869 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام کرم چند گاندھی اور والدہ کا نام پتلی بائی تھا۔

1883: پوربندر کے ایک مرچنٹ گوکل داس ماکن جی کی بیٹی کستور بابائی سے شادی ہوئی۔

1885: جب گاندھی جی 15 سال کے تھے تب ان کی پہلی اولاد کی پیدائش ہوئی لیکن وہ صرف کچھ دن ہی زندہ رہی اور اسی سال کے شروعات میں گاندھی جی کے والد کرم چند گاندھی بھی چل بسے۔

1887: میٹرک کا امتحان ’راج کوٹ‘ (گجرات) کے سمل داس کالج سے پاس کیا۔

1888: بیرسٹر بننے کے لیے لندن گئے۔

1893: پور بندر کے مسلمانوں کی ایک فرم کے وکیل کی حیثیت سے ’نتال‘ (جنوبی افریقہ) روانہ ہوئے۔ وہاں ہندوستانیوں کے ساتھ ہو رہی ناانصافیوں اور امتیازات سے متاثر ہوئے اور بہت جلد ان حالات کے خلاف جدوجہد پر کمربستہ ہو گئے۔ ’نتال انڈین کانگریس‘ نام کی ایک سیاسی ایسوسی ایشن قائم کی اور ہندوستانیوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے اور ان کے مسائل کی تشہیر کے لیے Indian Opinion نام کا اخبار جاری کیا۔

1897: گاندھی ’ڈربن‘ میں اترے تو سفید آباد کاروں کے ایک ہجوم نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ تاہم انھوں نے بھیڑ کے کسی بھی رکن کے خلاف الزامات عائد کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ اپنے ذاتی مسئلے کے لیے وہ عدالت نہیں جائیں گے۔

1899: ’بوئر جنگ‘ میں برٹش کی حمایت کی اور ’انڈین یونٹس ایمبولینس‘ کی رہنمائی کی۔

1906: ’ڈربن‘ لوٹے اور بارہ سال قیام پذیر رہے۔ ’جوہنسبرگ‘ میں آفس قائم کیا جو ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔

1906: ٹرانسوال میں ایک قانون پاس ہوا جس کے تحت ہندوستانیوں کو اپنا رجسٹریشن کروانا اور پاس ساتھ رکھ کر چلنا لازمی تھا گاندھی جی نے اس ہتک آمیز قانون کے خلاف جدوجہد کی اور پہلی بار ستیہ گرہ (حق کی بارگاہ) یا عدم تشدد پر مبنی احتجاج کا طریقہ اختیار کیا۔

1907: گرفتار کیے گئے اور نو مہینے کی قید کی سزا دی گئی، ستیہ گرہ کے دوسرے مرحلے کی رہنمائی کی جس کے تحت ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کے جم غفیر نے اپنے رجسٹریشن سرٹی فکیٹس کو نذر آتش کر دیا۔

1908: گاندھی جی کو لکھنے کا جنون تھا۔ گاندھی کی ابتدائی تصانیف میں سے ایک ’ہند سوراج‘ گجراتی زبان میں چھپی۔ کئی دہائیوں تک گاندھی نے گجراتی اور ہندی کے علاوہ انگریزی اخبارات میں ادارت کے فرائض سرانجام دیے اور یہ سلسلہ جنوبی افریقہ میں بھی جاری رہا۔ لندن سے جنوبی افریقہ کے سفر کے دوران ’ہند سوراج‘ یا ’انڈین ہوم رول‘ نام کی کتاب لکھی۔

گاندھی جی کو لکھنے کا جنون تھا گاندھی کی ابتدائی تصانیف میں سے ایک ’ہند سوراج‘ گجراتی زبان میں چھپی۔ کئی دہائیوں تک گاندھی نے گجراتی اور ہندی کے علاوہ انگریزی اخبارات میں ادارت کے فرائض سر انجام دیے اور یہ سلسلہ جنوبی افریقہ میں بھی جاری رہا لندن سے جنوبی افریقہ کے سفر کے دوران ’ہند سوراج ‘ یا ’انڈین ہوم رول ‘نام کی کتاب لکھی۔

1915: 24 سال کی عمر میں ہندوستان واپس آئے۔ اپنے دائرہ کار کا تعین کرنے سے پہلے انھوں نے ہندوستانی حالات کے مطالعے کا فیصلہ کیا۔

1916: احمد آباد میں سابرمتی آشرم قائم کیا جہاں ان کے پیروکار اور دوست سچائی اور عدم تشدد کے آدرش سیکھتے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

1917: چمپارن (بہار) کے کسانوں پر یہ پابندی عائد کردی گئی کہ وہ نیل کی کھیتی اپنی زمین کے حصے پر کریں اور اسے برٹش پودکاروں کو متعین قیمت پر فروخت کریں۔ گاندھی جی نے کسانوں کی شکایتوں کی سنوائی کے لیے ایک سسٹمیٹک انکوائری کروائی۔ اس سسٹم کو ختم کرانے میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس طرح گاندھی جی نے 'سول نافرمانی' کی پہلی جنگ جیتی۔

1918: احمد آباد میں مل مالکوں اور مزدوروں کے تنازعے میں مداخلت کی۔ مل مالکوں نے چوتھے دن ہی مزدوری میں 35 فیصد کا اضافہ کردیا۔

1918: گجرات کے کیرا ضلع میں فصل کے برباد ہوجانے کے باوجود حکام زمین کی پوری مال گزاری وصول کرنے پر آمادہ تھے۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہ کے ذریعے حکومت کو کسانوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور کردیا۔

1919: Rowlet Act کی مخالفت کی آواز اٹھائی اور اس قانون کی نافرمانی کے لیے ایک ستیہ گرہ سبھا شروع کی۔ نتیجے کے طور پر ملک گیر پیمانے پر 12 اپریل 1919 کو ایک روزہ ہڑتال ہوئی جس کے باعث پولیس فائرنگ ہوئی اور فسادات پھوٹ پڑے۔

'بوئر جنگ' کے دوران گاندھی جی کو ان کی خدمات کے اعتراف میں 'قیصر ہند میڈل' سے نوازا گیا تھا جسے انہوں نے جلیان والا باغ کے واقعے سے متاثر ہوکر واپس کردیا۔ نومبر 1919 میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔

1921: یکم اگست کو پہلی عدم تعاون تحریک شروع کی۔ 4 ستمبر کو کلکتہ میں کانگریس کا خصوصی اجلاس ہوا جس میں گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک کے ریزولوشن کو پاس کیا گیا۔ دسمبر میں ناگپور میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں اس تحریک کی

تصدیق ہوئی۔ نومبر میں 'پرنس آف ویلز' کی آمد کا بائیکاٹ کرنے کی تحریک شروع کی۔ غیر ملکی کپڑوں کو نذر آتش کیا گیا جس سے تشدد پھوٹ پڑا۔ حکومت نے خلافت تنظیم اور انڈین نیشنل کانگریس کو غیر قانونی قرار دیا اور عوام کے اجتماع اور جلوس پر پابندی لگا دی۔

1922: 10 مارچ 1922 کو گاندھی کو گرفتار کیا گیا، بغاوت کے لیے کوشش کے الزام میں چھ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ پونہ کے 'یرودا جیل' میں رکھا گیا۔

1924: پانچ فروری 1924 کو خراب صحت کی بنیاد پر جیل سے رہا کیے گئے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے ستمبر میں تین ہفتے کی بھوک ہڑتال کی۔

1925: ہندو مسلم ہم آہنگی کی خاطر عوام میں شعور پیدا کرنے کے لیے ملک کا دورہ کیا۔

1928: کلکتہ کے انڈین نیشنل کانگریس اجلاس میں شرکت کی جس میں کانگریس نے 'نہرو رپورٹ' کو قبول کرتے ہوئے ایک ریزولوشن پاس کیا کہ دسمبر 1929 تک اگر اسے حکومت نے قبول نہیں کیا تو کانگریس مکمل آزادی کی مانگ کرے گی اور اس کے لیے غیر متشددانہ عدم تعاون کے لیے جدو جہد کرے گی۔

1929: یورپ کا دورہ منسوخ کیا اور غیر ملکی کپڑوں کے بائیکاٹ کا اعلان کیا اور کلکتہ میں گرفتار کر لیے گئے اور ایک روپیہ جرمانہ ہوا۔

1930: نمک قانون توڑنے کے لیے 12 مارچ کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ احمد آباد سے ڈانڈی گئے۔ 6 اپریل کو سمندر کے پانی سے نمک بنا کر نمک قانون توڑا۔ اس میں 400 کلومیٹر (248 میل) تک کا سفر احمد آباد سے دانڈی، گجرات تک کیا گیا تاکہ خود نمک پیدا کیا جاسکے۔ سمندر کی طرف کیے گئے اس سفر میں ہزاروں کی تعداد میں ہندوستانیوں نے حصہ لیا۔

1931: 5 مارچ کو گاندھی-اروین سمجھوتہ عمل میں آیا جس کے تحت گاندھی جی نے سول نافرمانی کے اعلان کو واپس لیا لارڈ اروین نے ان کے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا اور نمک قانون میں ترمیم کی تاکہ لوگ اپنے ذاتی استعمال کے لیے سمندری ساحل سے نمک حاصل کر سکیں۔ 7 دسمبر کو دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے کانگریس کے بااختیار نمائندے کی حیثیت سے لندن تشریف لے گئے۔ لندن سے واپس ہوکر حکومت کے جابرانہ رویے کو دیکھتے ہوئے سول نافرمانی تحریک کو دوبارہ شروع کیا۔

1932: گرفتار کر لیے گئے اور پونے کی جیل بھیج دیے گئے۔ 20 ستمبر کو مون برت پر بیٹھ گئے جو 26 ستمبر کو توڑا۔ جب ان کے مطابق اس ایوارڈ میں ترمیم کر دی گئی ستمبر میں ہی انھوں نے All India Anti Untouchability League کی شروعات کی۔

1933: ہفتہ وار ہریجن جاری کیا۔ سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کر دیا۔ اسی سال اکتوبر میں کانگریس سے سبک دوش ہو گئے۔

1939: پرسنلی اسٹیٹ میں بڑھتے ہوئے انتشار اور بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ کشیدگی سے پریشان ہوکر راج کوٹ میں بھوک ہڑتال پر بیٹھے۔ نازی جرمنی کے پولینڈ پر حملے سے دوسری عالمی جنگ 1939 میں پھوٹ پڑی۔ ابتدا میں گاندھی نے برطانوی کوشش کی 'غیر متشدد اخلاقی حمایت' کی پیشکش کی، لیکن کانگریس کے دوسرے رہنما عوام کے منتخب نمائندے کی مشاورت کے بغیر ہندوستان کو جنگ میں یک طرفہ شامل کیے جانے سے ناراض تھے۔ سب نے کانگریس کے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا۔ طویل بحث کے بعد، گاندھی نے اعلان کیا کہ ہندوستان ایک جمہوری آزادی کے لیے لڑنے جا رہا ہے وہ جنگ کی پارٹی نہیں بنے گا، جبکہ خود ہندوستان کو آزادی سے

محروم رکھا جا رہا ہے۔ جنگ بڑھنے کے ساتھ، گاندھی نے آزادی کے لیے ان کی مانگ کو تیز کر دیا۔

1940: مارچ میں جب آل انڈیا مسلم لیگ نے 'دوقومی نظریہ' کو باضابطہ طور پر قبول کیا تو گاندھی جی نے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ میں دوقومی نظریے کا کبھی دل سے ساتھ نہیں دے سکتا۔ اکتوبر میں انفرادی سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا تو ونوبا بھاوے کو ستیہ گرہ کے لیے پہلا لیڈر منتخب کیا۔

1942: Cripps Mission کی مخالفت کی اور ورکنگ کمیٹی کو اسے رد کردینے کی رائے دی اور اس پیشکش کو Post Dated Cheque کا نام دیا۔ اپریل میں انگریزوں کو ہندوستان سے فوراً واپس جانے کا مشورہ دیا کھلے طور پر یہ اعلان کردیا کہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان دوستانہ مفاہمت اور تعاون بالکل ممکن نہیں۔ 14 جولائی کو وار دھا میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اعلان کردیا کہ برطانوی حکومت کا ہندوستان میں جلد از جلد خاتمہ لازمی ہے۔ 15 اگست کو ممبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھارت چھوڑو تجویز کو پاس کیا۔ اس بھارت چھوڑو تجویز پر گاندھی جی نے کہا کہ میں مکمل آزادی سے کم کسی چیز پر مطمئن ہونے والا نہیں۔ اس کوشش میں ہم 'کریں گے یا مریں گے'، ہندوستان چھوڑو جدوجہد بڑے پیمانے پر گرفتاریوں اور بے اندازہ تشدد کے ساتھ تاریخ کی سب سے زیادہ مضبوط تحریک بن گئی۔ ہزاروں مجاہدین آزادی پولس کی گولیوں سے قتل یا زخمی ہوئے اور ہزاروں کو گرفتار کیا گیا۔ 19 اگست کو گاندھی جی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ارکان کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے پونہ کے آغا خان پیلس میں قید کیا گیا۔ اس تاریخی بھارت چھوڑو تحریک کا سب سے بڑا رول یہ رہا کہ اس سے آزادی کی مانگ قومی تحریک کے ایجنڈے میں سرفہرست آگئی۔

1943: فروری میں جیل کے اندر ہی بھوک ہڑتال پر بیٹھے جو 16 دنوں تک جاری رہی۔ یہ دراصل حکومت کو ایک جواب تھا اس دباؤ کا جو ہو رہے تشدد کی مذمت کرنے کے لیے ان پر ڈال رہی تھی جب کہ حکومت اس تشدد کی خود ذمے دار تھی۔

1944: ان کی بیوی کستوربا 18 ماہ قید کی سزا کے بعد 22 فروری 1944 کو وفات پا گئیں۔ چھ ہفتوں کے بعد گاندھی کو ایک سخت 'ملیریا کے حملے' کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں جنگ کے اختتام سے پہلے 6 مئی 1944 کو گرتی صحت اور ضروری سرجری کی وجہ سے رہا کر دیا گیا۔ کانگریس کی مانگ بھارت چھوڑو کے مقابلے میں مسلم لیگ کا نیا نعرہ تقسیم کرو اور چھوڑو شروع ہوا۔ جس سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی۔ گاندھی جی جیل سے رہا ہوئے اور اس کے بعد سب سے پہلے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے کوشاں ہو گئے جو ان کی زندگی کا اہم نصب العین تھا اور پھر جناح سے گفتگو جاری کی۔ جو 27 ستمبر کو اختتام پذیر ہوئی۔ گاندھی جی اس بات پر مصر تھے کہ کوئی بھی بٹوارہ انگریزوں کے جانے کے بعد باہمی رہنمائی سے ہو۔

1948: 30 جنوری 1948 کو ایک عبادتی خطبے کے لیے چبوترے کی طرف جاتے وقت گاندھی جی کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ گوڈسے اور اس کے ساتھی سازش کار نارائن آپٹے کو عدالتی کارروائی کے بعد مجرم قرار دیا گیا اور 15 نومبر 1949 کو ان دونوں کو پھانسی دے دی گئی۔ گاندھی کی سمادھی راج گھاٹ نئی دہلی میں ہے۔ جس پر بڑے حروف میں 'ہے رام' لکھا ہوا ہے۔ عموماً یہ گاندھی کے آخری الفاظ مانے جاتے ہیں مگر اس میں اختلاف ہے۔

■

Razdan Shahid
Abgila, Post: Buniyad Gunj
Gaya-823003 (Bihar)

نئے قلمکار پیدا کرنے کی ضرورت ہے

عبدالودود انصاری

س: بچپن کی کون سی باتیں/ شوخیاں /شرارتیں اب بھی آپ کو یاد آتی ہیں؟

ج: سچ پوچھیے تو جب میں پانچ چھ سال کا تھا تو اس وقت میں نماز اللہ کی ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ ابا کے ڈر سے پڑھتا تھا۔ کبھی کبھی ابا جب جماعت کی نماز میں شریک ہوں اور مجھے دیر ہو جاتی تو میں بغیر وضو کے جماعت کے ساتھ کھڑا ہو جاتا اور امام کے سلام پھیرنے کے ساتھ میں بھی سلام پھیر دیتا تھا کیونکہ ابا سلام پھیرنے کے بعد پیچھے دیکھا کرتے کہ میں موجود ہوں یا نہیں۔ حالانکہ اچھے بچوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ نماز اللہ کو خوش کرنے کے لیے پڑھنی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ مجھے اپنی مسجد کے مؤذن صاحب کے صاجبزادے سے دوستی تھی۔ رمضان میں مغرب کے قبل مسجد جاتا، وہ افطاری میں اچھی اچھی چیزوں کو دوسرے لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر کے میری جیب میں بھر دیتا اور میں مغرب کی نماز کے بعد اسے من و سلویٰ سمجھ کر خوشی خوشی کھاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ نہیں دیتا تو میں اسے مارتا کیونکہ میں اس سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ بیچارہ دوسرے دن پہلے دن کا بقایا جات کو پوری بھی کر دیتا تھا۔ ویسے اچھے بچے ایسا نہیں کرتے ہیں اور نہ کرنا چاہیے۔ یہ دو واقعے جب بھی یاد آتے ہیں تو ہنستا بھی ہوں اور شرمسار بھی ہوتا ہوں۔ لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بچپن اور شرارت ایک سکہ کے دو رخ ہوتے ہیں۔

یہ زندگی کچھ بھی ہو مگر اپنے لیے تو
کچھ بھی نہیں بچوں کی شرارت کے علاوہ

(عباس تابش)

حقیقت یہ بھی ہے ہر کوئی یہ کہنے پر مجبور ہے۔

خوبصورت تھا اس قدر کہ محسوس نہ ہوا
کب، کیسے اور کہاں میرا بچپن گزرا

عبدالودود انصاری کی کتابوں کے عکس

س: بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنف کون تھے اور اب کون ہیں؟

ج: دراصل بچپن کا پسندیدہ مصنف تو یاد نہیں ہے لیکن اب میرا پسندیدہ مصنف قبلہ ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی، دہلی ہیں جن کی کتابوں کر پڑھ کر میں بچوں کا سائنسی ادیب بننے میں کامیاب ہوا۔ ان کے کیڑے پر لکھی کتابوں کا مطالعہ کر کے میں 'کیڑا کوئز' لکھنے میں بھی کامیاب ہوا جو اردو میں کیڑے پر پہلی کوئز کی کتاب ہے۔

س: بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

ج: 'دینی تعلیم کا رسالہ' جن کے بعض جملے اب بھی یاد ہیں۔ سچ بولو، سچوں کے ساتھ رہو، ہر ایک سے بھلائی کرو، کسی کو مت ستاؤ، برائی کا بدلہ بھلائی سے دو، استاد بھی ماں باپ کے برابر ہیں، یہی اسلام سکھاتا ہے اور اسلام بہت آسان مذہب ہے۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ ان جملوں کے اندر کتنی گہرائی ہے اور بچوں پر کس طرح یہ جملے مثبت اثر ڈالتے ہیں اور باادب بناتے ہیں۔

س: بچپن میں بچوں کے کون سے رسالے پڑھتے تھے؟

ج: ماہنامہ مسرت اور غنچہ۔

س: بچوں کے ذہنی وفکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟

ج: میری تو رائے ہے کہ 'دینی تعلیم کے رسالے' جیسی کتابیں بچوں کو پڑھائی جائیں۔ دوسرے ایسے ادیبوں کے مضامین پڑھائے جائیں جنھوں نے بچوں کی نفسیات اور دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے مضامین لکھے ہوں اور ان کے اندر بڑے خواب دیکھنے اور کچھ کر گزرنے کے عزائم کا ذکر ہو بلکہ مضامین ایسے ہوں جو بچوں میں احساس پیدا کر دیں کہ تم کچھ بھی یعنی سب کچھ کر سکتے ہو۔

س: زبان و بیان بہتر بنانے کے لیے کن مصنّفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہو سکتی ہیں؟

ج: میری جہاں تک جانکاری ہے کہ بچوں کے ہر مصنّفین کی کتابوں کے زبان و بیان بہتر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے سے میں کہوں گا کہ ہر گھر میں بچوں کے رسالے و اخبارات پابندی سے آنا چاہیے۔ سب سے پہلے انھیں گارجین پڑھیں پھر بشاشت سے بچوں کو پڑھنے کی ترغیب دیں۔ زبردستی ہرگز نہ کریں۔ جب وہ آپ کو پڑھتے دیکھیں گے تو وہ بھی خود بخود مطالعہ کریں گے۔ آخری میں کھانے و شام ناشتے کے بعد خوشگوار ماحول بنا کر مذاکرہ کریں کہ کس نے کیا پڑھا اور کون سی نئی بات سیکھی۔ گھروں میں صحیح اردو بولنے کا رواج قائم کیا جائے۔ اسکوں میں درجہ ششم تک اردو گرامر کی کتابیں ضرور پڑھائی جائیں۔

س: مستقبل اور کیریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا؟

ج: دیکھیے بچہ سات برس کا ہوتا ہے تو اسی وقت سے وہ اپنے

مستقبل کے تانے بانے بننا شروع کر دیتا ہے جس کا اظہار پہلے اپنے ماں باپ سے کرتا ہے اور اس کے بعد اس کا اظہار اپنے استاد سے کرتا ہے۔ بس اس کے بعد ہی سرپرست اور استاد بچے کی رہنمائی کرنا شروع کر دیں۔ میرا ماننا ہے کہ بچے کتاب کا مطالعہ کر کے اپنا مستقبل یا کیریئر نہیں سنوارتے ہیں بلکہ معاشرے میں مختلف شعبوں کی ترقیات، پذیرائی اور احترام کو دیکھ کر مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔

س: اپنے سوانح اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں!

ج: میرا نام عبدالودود انصاری ہے۔ میں ایک سبک دوش معلم ہوں۔ میری عمر 65 سال ہے۔ میں نے میٹرک کے بعد حساب میں بی ایس سی (آنرز) اور ایم ایس سی کیا۔ اس کے بعد ایم ایڈ، وگیان رتن اور فزیکل ایجوکیشن کا کورس مکمل کیا۔ میرا بچپن غریبی میں گزرا۔ بچپن کا ماحول غیر تعلیمی تھا۔ قبلہ والد سخت مذہبی اور نظم ونسق کے پابند تھے۔ پڑھائی کے لیے والد سے مار بھی خوب کھائی جس وجہ سے استاد کی مار سے محفوظ رہا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک اسکول میں حساب کا معلم بنا۔ پھر پرائمری اسکولوں کے استادوں کے ٹریننگ کالج میں 7 2 سال پرنسپل کے عہدے پر فائز رہا۔ درجہ دوئم تا دہم سائنس کی نصابی کتابیں تصنیف کیں۔ اب تک میرے تقریباً 400 سائنسی و ادبی مضامین شائع ہو چکے ہیں اور اللہ کے فضل سے 32 سائنسی کتابیں منظر عام پر آ گئی ہیں۔ آپ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی شائع شدہ میری چار کتابوں میں تین کتابیں باتوں باتوں میں سائنس، آؤ سائنسی خط لکھیں اور آؤ سائنسی خط پڑھیں ضرور پڑھیں۔ اب میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر سائنسی مضامین اور سائنسی کتابیں لکھنے میں بے حد مصروف ہوں۔

س: آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج: بچوں کے لیے لکھنے کا خیال بچوں کے رسالے پڑھنے کے بعد ہی آیا۔ میں تو درسی سائنس کی کتابیں کئی لکھ چکا تھا۔ جب ماہنامہ اردو دنیا شروع شروع پڑھنے لگا تو اس وقت اس میں بچوں کا گوشہ ہوتا تھا جس میں بچوں کے لیے مضامین چھپتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس صفحے کے لیے مضمون لکھا جائے مگر یہاں بڑے بڑوں کی بادشاہت دیکھ کر ڈر لگنے لگا مگر ہمت کر کے ایک مضمون 'بجلی رانی' مکالمے کی شکل میں بجلی پر معلومات پیش کرتے ہوئے لکھ بھیجا اور مضمون اردو دنیا (اکتوبر 1999) میں من وعن شائع ہو گیا۔ مدیر نے تعریف کی اور قاری نے بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد بچوں کے لیے مسلسل لکھنے لگا۔ ہاں دوسرا واقعہ ہے کہ شروع میں جب ماہنامہ اردو سائنس، دہلی شائع ہوا تو اس کا اشتہار دیکھ کر میں مدیر، ڈاکٹر محمد اسلم پرویز سے رسالہ بھیجنے کی درخواست کی۔ موصوف نے کئی رسالے تحفے کی شکل میں بھیجے اور مضمون بھیجنے کو کہا۔ میں نے ایک مضمون بعنوان 'فیثا غورث۔ ایک مطالعہ' لکھ بھیجا۔ یہ مضمون ماہنامہ اردو سائنس، دہلی (مارچ 1995) میں شائع ہو گیا اور اس کے بعد مدیر محترم نے لکھا کہ مضمون اچھا ہے لیکن کچھ تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ آپ مضامین لکھ کر بھیجتے رہیں۔ میں مضمون تسلسل کے ساتھ بھیجتا رہا اور وہ نوک پلک سنوار کر شائع کرتے رہے۔ بس انہی دو رسالوں کی وجہ سے میں بچوں کا سائنسی ادیب بنا۔

س: آپ کی پہلی تخلیق کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟

ج: میری پہلی تخلیق سب سے پہلے جب میں آٹھ سال کا تھا (غالباً 1968 کی بات ہے) تو ماہنامہ مسرت (پٹنہ) میں شائع ہوئی تھی۔ مضمون کا عنوان تھا: ''ملک یا شہر کا نام تلاش کیجیے: دو جملے یاد ہیں:

منّی امی کا پیر سہلا رہی ہے۔ (جواب: پیرس) اور یہ باجا واحد کی ہے۔(جواب: جاوا) شروع میں تخلص واجد لکھتا تھا یعنی عبدالودود واجد۔ حالانکہ واجد کا معنی معلوم نہیں تھا۔

س: آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟

ج: میں بچوں کا سائنسی ادب سے منسلک ہوں۔ فی الحال میں سائنسی موضوعات کو مکتوب نگاری اور مکالمہ نگاری کے ذریعے پیش کرنے میں مصروف ہوں۔ ماضی میں سائنسی موضوعات کو یک موضوعی شکل میں پیش کر چکا ہوں جیسے جانور کوئز، پرندہ کوئز، کیڑا کوئز، سانپ کوئز اور فلک کوئز۔ ماضی اور حال کے سائنسدانوں کی خدمات پر بھی کتابیں لکھ چکا ہوں۔ میں بچوں کا سائنسی ادب پر نئی نئی اصناف کا متلاشی ہوں۔

س: کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟

ج: دیکھیے میری خوش قسمتی یہ ہے کہ میں تقریباً تیس برسوں تک بچوں کے بنیادی استادوں کو تربیت دینے میں کامیاب ہوا ہوں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے جس وجہ سے مجھے ایک لمبے عرصے تک بچوں کی نفسیات (Child Psychology) پڑھانی پڑی ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوا ہے کہ بچوں کے مضامین لکھتے وقت بچوں کی نفسیات اور ان کے ذہنی مطالبات خود رو پودوں کی طرح اگنے لگتے ہیں جو اللہ کی طرف سے میرے اوپر بہت بڑی عنایت ہے۔

س: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ج: الحمد اللہ۔ جب بھی کسی موضوع پر بچوں کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو کسی طرح کی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات ایک مضمون دو تین نشستوں میں مکمل ہوتا ہے۔

س: ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟

ج: اللہ کا شکر ہے کہ سنجیدہ اور علمی شخصیت میرے بہت قدر داں ہیں۔ ان کی ہمت افزائی اور مشوروں سے مستفیض ہوتا رہتا ہوں۔ ویسے حکومت کے اردو ادارے یا نیم ادارے، تنظیمیں اور اکادمیاں بچوں کے سائنسی ادب کو فاضل ادب سمجھ کر سائنسی ادیب پر گھاس نہیں ڈالتی ہیں۔ اب تک دیگر سائنسی ادیبوں کی طرح میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔

س: کیا آپ ابھی بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟

ج: جی ہاں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور ایک وجہ پڑھنے کی یہ بھی ہے کہ اکثر بچوں کی سائنسی کتابوں پر تبصرے کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں جس وجہ سے بھی کتابیں پڑھنی ناگزیر ہو جاتی ہیں۔

س: انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں؟

ج: سچی بات تو یہ ہے کہ آج تک میں نے اردو کے سوا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں کو پڑھا ہی نہیں۔ الحمد اللہ۔ ہم جیسے اردو مصنّفین کے اندر سائنسی ادب کی امامت کرنے کی تمام شرائط موجود ہیں تو پھر دوسری زبانوں کے رسالوں کے مصنّفین کا مقتدی کیوں بنیں۔ ویسے اچھی اور بہترین تخلیق سبھی زبانوں میں ہیں جنھیں کبھی کبھی مستعار لی جا سکتی ہیں۔

س: کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا مکمل رسالہ موجود ہے؟

ج: ہندوستان میں کئی اردو رسالوں میں بچوں کی دنیا اور امنگ کی اشاعت عروج پر ہے جن کا معیار دوسری زبانوں کے رسالوں سے بہت کم نہیں ہے۔ میرا ذاتی ماننا ہے کہ معیاری رسالے کے لیے ان میں آدھے مضامین ادبی ہوں اور آدھے

مضامین سائنسی ہوں اور ان رسالوں سے نئے قلم کار پیدا ہونے کے ذرائع موجود ہوں۔

س: بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: ہندوستان میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں میں زبان و بیان تو تشفی بخش ہوتے ہی ہیں۔ ویسے جہاں تک زبان و بیان کی بات ہے تو احقر کے اندر بھی کمی ہے جس کا احساس کبھی کبھی ہوتا ہے۔اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ سائنسی مصنّفین اپنے مضامین کی تکمیل کے بعد کسی معتبر ادبی شخصیت کو دکھالیں۔مواد کا جہاں تک تعلق ہے تو پھر اپنی بات دہراؤں گا کہ رسالے میں نصف ادبی اور نصف سائنسی مضامین ہونے چاہیے اور نئے قلم کار بننے کے جراثیم موجود ہوں۔

س: معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: ہندوستان میں 'بچوں کا ادب' پر لکھنے والوں کی تعداد تو کافی ہے لیکن 'بچوں کے سائنسی ادب' پر لکھنے والوں کی تعداد بڑی آسانی سے گنی جاسکتی ہے۔چال کچھوے سے بھی سست ہے۔اس تناظر میں کسے مطمئن اور کسے غیر مطمئن کہوں۔ بس قدرے غنیمت۔اس مسئلے کا حل پھر کبھی...!!

س: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟

ج: آج کی دور کیا ہر دور میں بچوں کے لیے دو طرح کے موضوعات کی ضرورت ہے۔ایک اردو ادب (نثر اور نظم) اور دوسرا سائنسی ادب۔اردو ادب کے ذریعے اخلاق اور اطوار کی آبیاری ہوتی ہے جس سے بچے باادب ہوتے ہیں جب کہ سائنسی ادب کے ذریعے سائنسی علوم سے دلچسپی ہوتی ہے جس سے اس کے حصول میں آسانی ہوتی ہے۔

س: بچوں کی تعلیم و تربیت کے کچھ مفید تجاویز اور مشورے!

ج: بچوں کے اندر تعلیم و تربیت کی مٹھاس بنیادی استادوں کے ذریعے پیدا ہوتی ہے جو اطفال ادب کے کشکول کے ذریعے تقسیم کیے جاتے ہیں۔لہٰذا پہلے بنیادی استادوں کے اندر ادب اطفال کی اہمیت پیدا کرنی ہوگی اور ان کے اندر دلچسپی پیدا کرکے کام آگے بڑھانا ہوگا۔

س: ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟

ج: کوشش کی جائے کہ آدھے مضامین ادبی اور آدھے سائنسی ہوں۔ نئے قلم کار پیدا کرنے کے مواقع فراہم ہوں۔نئی نئی اصناف پر بچوں سے مضامین طلب کیے جائیں۔مثلاً ادبی کوئز، سائنسی کوئز، ادبی و سائنسی کہانی، ادبی و سائنسی چارٹ وغیرہ۔ ننھے منے قلم کاروں کے مضامین شائع ہونے کے بعد انھیں سند اور ہلکے پھلکے انعامات سے نوازے جائیں۔مدیر کی جانب سے موبائل سے مبارکباد دی جائے۔

س: بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

ج: ''پیارے بچو! تم ہر وہ کارنامہ انجام دے سکتے ہو جو دوسری زبان والے بچے دے سکتے ہیں بلکہ تم ان سے بہتر انجام دے سکتے ہو۔تم پہلے بڑا بننے کا خواب دیکھو پھر اس کی تعبیر کے لیے دل و جان سے محنت شروع کردو۔یقیناً تمھیں کامیابی ملے گی اور یاد رکھنا۔

ہار ہوجاتی ہے جب مان لیا جاتا ہے
جیت تب ہوتی ہے جب ٹھان لیا جاتا ہے
(شکیل اعظمی)

لہٰذا ترقی کرنے کے لیے ٹھان لو۔''

■

Abdul Wadood Ansari
Shadaab Manzil, House No: 43.6, B.L. No: 6
Kankinara - 743126 (West Bengal)
Mob.:9674895325

نئی کونپل

متین اچل پوری

لگا کر ہلکا ہلکا غازہ کونپل
نکل آئی ہے تازہ تازہ کونپل
خزاں تو ہر طرف چھائی ہوئی تھی
زمیں کی روح مرجھائی ہوئی تھی
ذرا سا کھول کے دروازہ کونپل
نکل آئی ہے تازہ تازہ کونپل

ہو پھر سے عام رحمت اپنے رب کی
نئے سپنے سجیں پلکوں پہ سب کی
لگا کر سارا یہ اندازہ کونپل
نکل آئی ہے تازہ تازہ کونپل

نئی رت میں نیا گن گان ہوگا
زباں پہ سورۂ رحمان ہوگا
زمیں کا سن کے پھر آوازہ کونپل
نکل آئی ہے تازہ تازہ کونپل

تناور پیڑ کہلائے گی برسوں
ہمیں یہ فیض پہنائے گی برسوں
خدا سے عزم پا کے تازہ کونپل
نکل آئی ہے تازہ تازہ کونپل

(تعارف فروری 2021 میں ہوچکا ہے)

■

Mateen Achalpuri
Akbari Chowk, Biyabani
Achalpur - 444806
Amravati (Maharashtra)

پیام شاعر

مناظر حسن شاہین

کشیدہ حالات سے نہ ڈرنا
تم اپنے خوابوں میں رنگ بھرنا
یہی ہے پوجا، یہی عبادت
خدا کے بندوں سے پیار کرنا
ڈرائے گی کیا یہ موج دریا
ہمیں تو ہے ڈوب کر ابھرنا
یہی تو انسان کا ہے زیور
تم حسن اخلاق سے سنورنا
اڑو ابھی آسمان چھو لو
فلک کے زینوں سے پھر اترنا
مصیبتوں کی بساط کیا ہے
تمھیں تو ہے سونے سا نکھرنا
چٹانوں سے بھی نہیں رکیں گے
سبق یہ دیتا ہے بہہ کے جھرنا
نگاہ ہو منزلوں سے آگے
کسی بھی منزل پہ مت ٹھہرنا
بلا رہے ہیں وہ چاند تارے
تو کہکشاں سے بھی گزرنا
کہیں نہ جائیں گے ہند سے ہم
یہیں ہے جینا یہیں ہے مرنا

(تعارف جنوری 2020 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے)

■

Manazir Hasan Shaheen
H. No.: 60, Millat Colony
Gaya- 823001 (Bihar)
Mob.:9661214111

شاھد جمیل

کمپیوٹر

تیرا ٹیوٹر، میرا ٹیوٹر
کتنا اچھا یہ کمپیوٹر!
اس کے اندر ایک خزانہ
علم کا ایسا تانا بانا!
معلومات کے لاکھ سمندر
چھپے ہیں اِک ڈبّے کے اندر
'سی۔پی۔یو' ہے مغز جو اس کا
'مانیٹر' کو سمجھو، چہرہ!
مٹھی میں 'ماؤس' متحرک
پڑھنا لکھنا جیسے پلک
چلتی ہے 'کی بورڈ' پہ انگلی
بنا قلم کے، بات یہ لکھ دی!
'انٹرنیٹ' کا جال سنبھالے
حل ڈھونڈے، احوال کھنگالے
ایک ذرا سی جنبش ہو، پھر
منظر، پس منظر سب حاضر
قصے، نقشے، نغمے، یادیں
لاکر رکھ دیتا ہے پل میں
مندر، مسجد، دانش گاہیں!
کھیل کے سو میدان بھی اس میں
گھر، دفتر، اسکول کہ کالج
اس سے زیادہ کس کو نالج؟
اقلیدس یا شعر و ادب ہو
اسے بھلا دشواری کب ہو؟
دوڑائے 'ای میل' کے گھوڑے
پلک جھپکتے خط پہنچا دے
کمپیوٹر کے سب دیوانے
یہ سب کی مشکل پہچانے

دنیا پر احسان ہے اس کا
کون ہے کمپیوٹر کے جیسا؟

(تعارف مئی 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Shahid Jameel
202-R.D Mansion
Ashiana-Digha Road (Opp: Axis Bank)
P.O: B.V. College
Patna - 800014 (Bihar)

رضاء الرحمن عاکف

بلبل

ننھی سی ایک چڑیا — بُلبُل ہے نام جس کا
نازک سا اس کا تن ہے — مخمل سا پیرہن ہے
سر پر ہے تاج اس کے — مقبول ہوئی جس سے
میٹھے ہیں گیت اس کے — لگتے ہیں سب کو اچھے
پھولوں میں ہے یہ رہتی — سب کو ہی پیار دیتی
ہے کتنی یہ تو پیاری — بچّے بھی اس پہ واری
ننھّی سی جان ہے یہ — اللہ کی شان ہے یہ
سب کو دلار اس سے — ہر اک کو پیار اس سے
جب پیڑ تھے گھروں میں — تب اس کی ڈالیوں میں
بُلبُل کا آشیاں تھا — اس کا وہی جہاں تھا
بدلا ہے اب زمانہ — اُجڑا ہے آشیانہ
جب سے ہیں پیڑ کاٹے — یہ دور ہم سے بھاگے
اے میرے پیارے بچو! — عاکف کی بات سمجھو
گر چاہو پھر بسانا — گھر میں شجر لگانا

جب گھر میں پیڑ ہوں گے
آئیں گے تب پرندے

(فروری 2021 کے شمارے میں ان کا تعارف شائع ہوچکا ھے)

■

Dr. Raza-Ur-Rahan Akif Sambhali
Kashana-e-Akif Miyan Sarai
Katra Bazar
Sambhal - 244302 (UP)

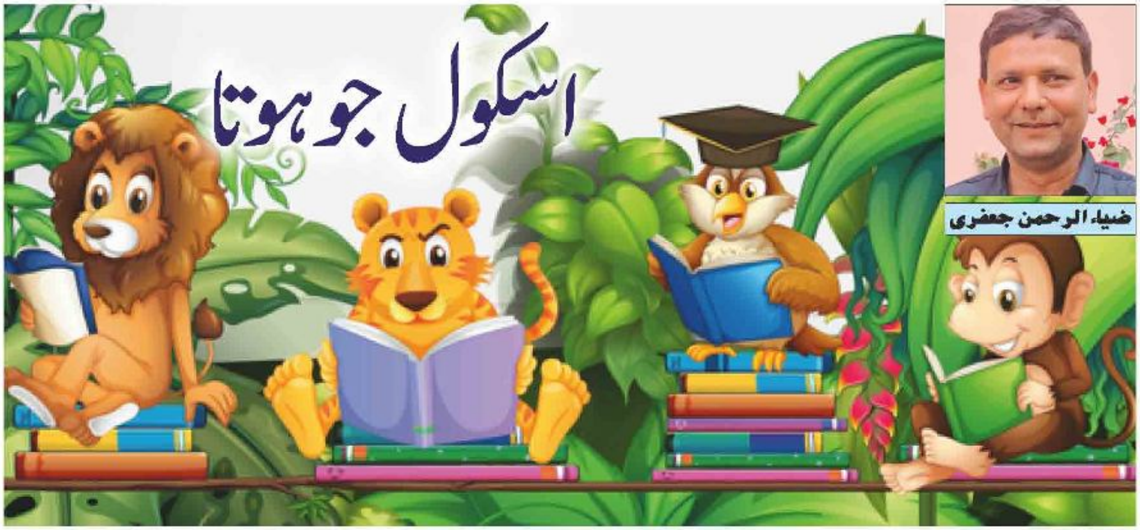

ضیاء الرحمن جعفری

اسکول جو ہوتا

جنگل میں اسکول جو ہوتا
کیوں اندھیرے میں یہ سوتا

پڑھتے لکھتے اور سمجھتے
شیر کسی کا خون نہ کرتے

اچھے سے پڑھ لیتا بندر
بن جاتا پھر ایک کلکٹر

چیونٹی پی ایچ ڈی کرلیتی
اور کالج میں لیکچر دیتی

الو اتنا پھر نہ ہوتا
ہوم ورک اس کا بھی ہوتا

سج کر تتلی مکتب جاتی
اور بھی اپنا رتبہ پاتی

آتی جب اسکول کی گاڑی
بیٹھتے سارے باری باری

یہیں کہیں پر ٹیوشن ہوتا
نہیں ذرا بھی ٹینشن ہوتا

بلی چوہا اور چھپکلی
آگے پڑھنے جاتی دلی
ہاتھی پڑھ کر جان یہ جاتے
نہیں یہ اتنا جسم پھلاتے

کوئی بنتا پڑھ کر ٹیچر
کوئی اس سے اور بھی بہتر

کہاں یہ پھر تو جنگل ہوتا
سب جنگل میں منگل ہوتا

(تعارف فروری 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Dr. Zeaur Rahman Jafri
Hindi Dept
Mirza Ghalib College
Gaya - 823001 (Bihar)
Mob.: 9934847941

نظم

میں ایک انسان ہوتا

میں اک انسان ہوں انسانیت سے میرا ناطہ ہے
یہ ہے احساس جو مجھ کو گناہوں سے بچاتا ہے
حیات اپنی ازل سے لے کر جو انسان آتا ہے
اسے اعمال سے وہ زندگی اپنی بناتا ہے
جو موسم کے مطابق پیرہن تبدیل ہے کرتا
وہ تم میں روتا ہے وقت مسرت مسکراتا ہے
محبت پیار کرنے کا نہیں جذبہ فقط جگ میں
محبت جذبہ ہے انساں کو جو انساں بناتا ہے
جہاں میں آنے کو ہے غالباً اب دور پتھر کا
نہیں انسان کو انسان نظر دنیا میں آتا ہے
نبھائے تو نبھائے دنیا والوں سے یہ کیا رشتے
ذرا سی چوٹ ہر کم بخت دل پہ ٹوٹ جاتا ہے

■

Dr. Azad
1794, HB Sector-15
Sonipat-131001 (Haryana)
Cell.: 7021724853

عظمت والے پھول

باغ میں ہم نے جا کر دیکھا کھلے ہوئے تھے پھول
ڈالی ڈالی رنگ برنگے لدے ہوئے تھے پھول
اوس کی بوندیں جمی تھیں ان کی پتی پتی پر
شبنم کے قطروں سے گویا دھلے ہوئے تھے پھول
بھینی بھینی خوشبو سارے باغ میں پھیلی تھی
بیلا جوہی چمپا چنبیلی مہکے ہوئے تھے پھول
جاتے ہوئے گھر دیکھے ہم نے ایسے بھی منظر
دولہے کے سر سہرے میں کچھ سجے ہوئے تھے پھول
ساتھ فریحہ اپی بھی تھیں ان کے بھی سر پر
بالوں میں گجرے کی صورت بندھے ہوئے تھے پھول
کمرے کی تزئین میں تھا کچھ ان کا بھی کردار
کئی رنگوں کے گلدانوں میں رکھے ہوئے تھے پھول
مہماں تھے مخصوص ہی کوئی جن کی آمد پر
راہ میں استقبال کو ان کی بچھے ہوئے تھے پھول
جانے کون خدا والے تھے جن کی تربت پر
چادر کی اک شکل میں تازہ چڑھے ہوئے تھے پھول
قدرت نے ان پھولوں کو کیا رتبہ بخشا ہے
عظمت والے کام میں ہر اک لگے ہوئے تھے پھول

■

Amanul Haq Balapuri
Darul Aman
Joolybess, Balapur
Akola (Maharashtra)

دیپک

فراق جلال پوری

فراق جلال پوری کے تعلق امبیڈکر نگر جلال پور سے ہے۔ شاعری انھیں وراثت میں ملی ہے۔ ان کے والد حافظ جلال پوری کا شمار استاد شعرا میں ہوتا ہے۔ مقتدر رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ بچوں کے ادب سے خاص دلچسپی ہے۔ ان کی تین نظمیں 'جھوٹ نہ بول'، 'محنت' اور 'قلم' بچوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں اور ماہیوں کا ایک مجموعہ 'رجم جھم ساون' زیر اشاعت ہے۔

طاق پہ جلتا پیارا دیپک
کرتا ہے اُجیارا دیپک
راہ میں چھوٹا ہو کہ بڑا
سب کا یار ہمارا دیپک
لڑتا ہے ہمت کے ساتھ
آندھی سے کب ہارا دیپک
دکھ کے ہے آگے سکھ کی چھاؤں
کرتا ہے یہ اشارا دیپک
روشنیوں کا سندر نام
جگنو، چندا، تارا، دیپک
جہاں پہ سورج پہنچ نہ پائے
وہاں کرے اُجیارا دیپک
جو بخشے آنکھوں کو نور
سدا چلے وہ پیارا دیپک

■

Feraq Jalalpuri
Mohalla: Qazipura
Post: Jalalpur
Distt.: Ambedkar Nagar - 224149

شمیم انجم وارثی

دوست کی امداد

اچانک مرے گھر مشرف کا آنا
مجھے آگیا یاد گزرا زمانا
مگر دیکھ کر شرٹ اس کی پرانی
اڈنے لگے میری آنکھوں میں پانی
محبت سے سوفے پہ اس کو بٹھایا
اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا
سبب اس سے گھر میں نہ آنے کا پوچھا
تو رو رو کے مجھ سے مشرف یہ بولا
مری مفلسی نے مجھے یہ ہوا دی
مکاں بیچ کے کردی بہنوں کی شادی
کہیں سر چھپاؤں مکاں بھی نہیں ہے
زمیں تو زمیں آسماں بھی نہیں ہے
اگر ہوسکے میری امداد کردو
دعا میری لو رب کو بھی شاد کردو
ہوئی آنکھ نم اس کی روداد سن کر
تصور میں تھا اپنے بچپن کا منظر
جہاں تک تھا ممکن مدد اس کی کردی
مشرف کی جھولی مسرت سے بھر دی

■

Shameem Anjum Warsi
237/2, Arbindapally, Garolia
Shimali 24 Pargana - 743133 (West Bengal)
Mob.: 9339680799

ایم نصراللہ نصر

بچوں کا باکمال شاعر: عبدالرحیم نشتر

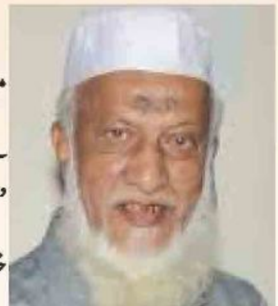

سخن اطفال یعنی بچوں کی شاعری بیشک ایک مشکل صنفِ ادب ہے۔ اس میں شاعر کو علمیت اور دانشمندی کے باوجود بچوں کی توتلی زبان میں اشعار گڑھنے پڑتے ہیں۔ پہلے ان کی ذہنی کیفیت اور شعور سخن کا اندازہ لگانا پڑتا ہے، ان کے ناپختہ اذہان سے رشتہ استوار کرنا پڑتا ہے پھر سلیس اور سادہ لفظوں میں مصرعے خلق کرنے پڑتے ہیں۔ آسان اور سہل پسند شاعری ہی بچوں کی پسندیدہ شاعری ہوتی ہے۔ ایسی شاعری ہی ان کی دلچسپی کا باعث بن سکتی ہے۔ دقیق الفاظ و غیر مانوس تراکیب بچوں کے ناپختہ ذہن میں سمانے سے قاصر رہتی ہیں۔ بچوں کی نفسیات کا خیال رکھنا بھی لازمی ہے۔ موضوعات کی مانوسیت ان کی پہلی پسند ہوتی ہے۔ اس جہان ادب کے بنیاد گزاروں میں نظیر اکبر آبادی، مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈاکٹر محمد اقبال، پنڈت برج نرائن چکبست، منشی تلوک چند محروم، مائل خیر آبادی، مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر اور شفیع الدین نیر وغیرہ کے نام شامل ہیں جنھوں نے ادب اطفال کو پروان چڑھانے میں عرق ریزی سے کام کیا ہے اور شہرت اور مقبولیت کے بام تک پہنچایا ہے۔ بعد کے لوگوں نے اس کے حسن میں چار چاند لگانے میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔

عبدالرحیم نشتر نے مذکورہ باتوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ آسان الفاظ و سہل اسلوب میں اچھی شاعری کی ہے۔ بچوں کو اپنی بات سمجھانے میں وہ کامیاب ہیں۔ بچوں کی شاعری کے تمام لوازمات کا انھوں نے اہتمام کیا ہے۔ ان کی نازک خیالی اور سہل پسندی کو دھیان میں رکھا ہے اور نئے نئے عام فہم موضوعات کو خوبصورت اشعار میں ڈھال دیا ہے۔ بقول پروفیسر ابن کنول:

''عبدالرحیم نشتر نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے عہد حاضر میں بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے (ان کی نظمیں) بچوں کے مزاج اور دلچسپی کو ملحوظ رکھ کر انتہائی سادہ اور عام فہم زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں انھوں نے بچوں سے متعلق زیادہ تر موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔'' (بچوں کا سنسار 2021)

بیشک نشتر صاحب نے ایک کامیاب استاد کی طرح بچوں کی نفسیات، خواہشات، جذبات اور رجحانات و میلانات کو سمجھا ہے، پرکھا ہے اور اسی ماحول اور سوندھی فضا میں اچھی شاعری کی ہے۔ ان کی نظمیں بچوں کی ذہنی آبیاری اور روحانی مسرت کی سبیل پیدا کرتی ہیں۔ ان کی شاعری کے کچھ نمونے دیکھیں۔

چڑیا رانی پھدک پھدک کر — اس ڈالی سے اس ڈالی تک
اس کیاری سے اس کیاری تک — باغ کا چکر لگا رہی ہے
رنگ و نغمہ لٹا رہی ہے — اپنا جادو جگا رہی ہے

(نظم: سچا ساتھی)

اے، بی، سی، ڈی، ای، ایف، جی — سب حرفوں کو جان گیا ہے
اے فار اپیل، بی فار بیٹ — شکلوں کو پہچان گیا ہے

(ننھا مصور)

جسے وقت کی قدر و قیمت رہے گی — وہی لطف ہستی اٹھاتا رہے گا
گئے سال کو جس نے یونہی گنوایا — نئے سال کو بھی گنواتا رہے گا

(جنوری کا ترانہ)

بچوں کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی چھوٹی بحر اور سہل الفاظ کی بنت کاری ہوتی ہے جسے سہل ممتنع بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایسی نظمیں آسانی سے کہی جاسکتی ہیں، پڑھی جاسکتی ہیں اور یاد کی جاسکتی ہیں۔ ایسی نظموں میں شعریت کا اہتمام کرنا بھی لازمی ہوتا ہے جس میں روانی ہو، ترنم ہو اور شائستگی و شگفتگی بھی ہو۔ الفاظ اتنے مانوس ہوں کہ بچوں کے ذہن میں سماسکیں۔ نشتر صاحب نے ایسی ہی نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں پند و نصائح اور تربیت سازی کے عناصر بھی مل جاتے ہیں۔ چند اشعار اور دیکھیں۔

بچہ بچہ پھول کی خوشبو   بچہ بچہ چاند کا چہرہ
بچہ بچہ سپنوں جیسا   بچہ بچہ میٹھا نغمہ
(ننھے بچے کھیل رہے ہیں)

صبح ننھے فرشتے آتے ہیں   روشنی بن کے پھیل جاتے ہیں
گھر سے اسکول تک سبھی رستے   جھومتے، ناچتے ہیں، گاتے ہیں
(یہ فرشتے، یہ پھول سے بچے)

ایک ذرا سا چمکا تھا   ابھی یہیں تھا کدھر گیا
ذرا جھلک دکھلائی تھی   ایک شعاع لہرائی تھی
مسجد کے میناروں سے   آنگن سے گلیاروں سے
کچھ لوگوں نے دیکھا تھا   کیا وہ آنکھ کا دھوکا تھا
لیکن نٹ کھٹ عید کا چاند   کیسا جھٹ پٹ عید کا چاند
اجلے گدلے بادل میں   شام کے میلے آنچل میں
مجھ سے چھپ کر بیٹھا ہے   شاید مجھ سے ڈرتا ہے
(نٹ کھٹ چاند)

بچوں کی نظموں میں مناظر فطرت کی عکاسی اور ان کے حسن کے تذکرے بچوں کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے دل میں قدرت کی کاریگری اور اس کی عظمت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ نشتر صاحب نے بڑی ہوشمندی سے مناظر فطرت اور فضائے قدرت کی عکاسی کی ہے۔ اپنی نظموں میں ان کی پینٹنگ کی ہے۔ جن کی تصدیق دیگر مبصرین نے بھی کی ہے۔ بقول ڈاکٹر مظفر حنفی:

''ان کی نظمیں معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہوتی ہیں۔ بچوں کی نفسیات سے واقفیت اور ان کی لفظیات پر مہارت نے اس عہد میں ادب اطفال تخلیق کرنے والوں کے درمیان انھیں امتیازی حیثیت عطا کی ہے۔''

اور حافظ کرناٹکی لکھتے ہیں ''عبدالرحیم نشتر کا تخیل کافی جاندار ہے۔ وہ جن موضوعات کو ہاتھ لگاتے ہیں ان میں جان ڈال دیتے ہیں۔ منظر نگاری اور تصویر کشی سے وہ اپنی نظموں کی فضا کو حسین تر بنا دیتے ہیں۔''

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ موصوف کی بچوں کی نظمیں رواں دواں اور سلیس و سادہ ہوتی ہیں جو بچوں کی سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہیں۔ ان کی نظموں میں بچوں کی دل بستگی کا سامان بھی ہوتا ہے اور دلکشی اور دلبری کا اہتمام بھی۔ ان کے مجموعے میں شامل 37 نظموں میں یہ فرشتے، یہ پھول سے بچے، بچارے فرشتے، میٹھی بات، کیوں نہ ہم پیار کریں، مذہب نہیں سکھاتا، گڑیا رانی، دردمندی، سچائی۔ نٹ کھٹ چاند، ننھا مصور، سچا ساتھی اور جنوری کا ترانہ اچھی نظمیں ہیں۔ بیشک یہ نظمیں بچوں کو پسند آئیں گی۔ ان کی کتاب 'بچوں کا سنسار' ادب اطفال میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس لیے کہ اس کے موضوعات، اسلوبیات اور زبان و بیان قابل احترام ہیں اور لائق ستائش بھی۔ ویسے ان سے اس سے بہتر کی امید بھی کی جاسکتی ہے۔

■

Md. Nasrullah
Shalimar Apartment
3A, Satyen Bose Road, Danish Sk. Lane
Bakultala, Howrah - 711109 (West Bengal)
Mob. : 9339976034
E-mail : nasrullah786nasr@gmail.com

سلمیٰ یوسف حسین

روٹیوں کا جلسہ

سعید بھاگا بھاگا آ رہا تھا کہ ٹھوکر لگی۔ اڑا اڑا دھم۔ ایسا گرا کہ پیشانی سے خون بہنے لگا۔ ماں بے چاری باورچی خانے میں تھی۔ روٹی توے پر چھوڑ گھبرا کر اسے اٹھانے دوڑ پڑی۔ روٹی کو یہ بے پروائی بری لگی، ارے کم از کم مجھے تو آگ سے اتار دیتی۔ وہ غصے سے پھول کر کپا ہوگئی اور انگاروں پر گر پڑی۔ اب تو اس کا بدن اور بھی جلنے لگا۔ کسی کل چین نہیں تھا۔ آخر جل بھن کر اس نے طے کیا کہ ایسے بے پروا مالک کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہیے۔ لڑھکتی لڑھکتی کھڑکی پر چڑھ باہر گلی میں کود پڑی اور آزادی کا لمبا سانس لیا۔ پھر ایک زوردار نعرہ لگایا۔ ''انقلاب زندہ باد'' بھائیو اور بہنو! آج تم اپنی آزادی کے لیے ہڑتال کردو آج ہمارا جلوس نکلے گا اور شام کو آزاد پارک میں جلسہ ہوگا۔

یہ آواز سنتے ہی آس پاس کے گھروں سے باجرے، جو، مکا کی روٹیاں پھلکے اور گیہوں کی چپاتیاں، روغنی اور خستہ ٹکیا سب انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگاتی کود پڑیں اور روٹیوں کا جلوس روانہ ہوا۔ آگے آگے جلی روٹی بڑا سا جھنڈا لیے نعرہ لگاتی جا رہی تھی۔ راستے میں ایک حلوائی دکان پر کڑھاؤ چڑھائے تھا۔ پوریاں کچوریاں تلی جا رہی تھیں۔ روٹیوں کا جلوس دیکھ کر وہ کڑھاؤ اور تھال سے کود کود کر جلوس میں شامل ہوئیں۔ ساتھ ہی ایک باورچی کی دکان تھی وہاں نان، باقر خوانی، کلچے اور پراٹھے پلیٹوں میں بیٹھے آرام کر رہے تھے۔ جلوس نے وہاں پہنچ کر نعرہ لگایا۔ پراٹھے خاں کی جے۔ کلچے اور نان تو پہلے ہی جلوس میں شامل ہوگئے تھے۔ اب پراٹھے خاں بھی آملے۔ باقر خوانی نے منہ پھیر لیا۔ راستے میں کچھ ڈبل روٹیاں بھی آکر شریک ہوگئیں اور جلوس سارے شہر کا چکر لگاتا آزاد پارک پہنچا۔ بسکٹ بھی تماشا دیکھنے کے لیے ساتھ ہوگئے اور جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ پراٹھے خاں صدر چنے گئے۔ سب سے پہلے ایک خستہ ٹکیا نے روٹیوں کا قومی ترانہ گایا۔ اس کے

بعد جلی روٹی تقریر کے لیے کھڑی ہوئی۔

صدر صاحب! بھائیو اور بہنو! اب وقت آ گیا ہے کہ ہماری قوم گہری نیند سے جاگے اور انسان کے ظلموں سے آزاد ہونے کی ترکیب سوچے۔ انسان کے ظلم ہمیں چین نہیں لینے دیتے ہیں۔ سب سے پہلے کسان ہمارے دانے سڑی مٹی، کھاد میں دفن کر دیتا ہے اوپر سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ڈالتا ہے۔ چند دن میں ہمارے دانے کا بیٹ پھٹ جاتا ہے اور ایک کلّا پھوٹ آتا ہے۔ یہ کچھ دنوں میں بڑا پودا بن جاتا ہے اور اس میں دانوں کی بہت ساری بالیں اگ آتی ہیں۔ جب ہم ہوا میں لہلہانے لگتے ہیں کسان ہم پر بیل چھوڑ دیتا ہے جو ہمیں بری طرح روندتے ہیں اور ہمارا بھوسے کا لباس تار تار ہو کر اتر جاتا ہے۔ ہم ننگے ہو جاتے ہیں۔ یہ بے رحم کسان ہمیں بورے میں بند کر کے بازار میں بنیے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ لوگ بنیے سے تھوڑا تھوڑا خرید کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ یہاں قصہ اتنا درناک ہے کہ بیان سے باہر۔ انسان ہمیں چکی میں پسوا کر ہماری ہڈی پسلی ایک کر دیتا ہے اور ہم آٹا کہلاتے ہیں۔

اب وہ ہمیں مٹکوں میں کنستروں میں بھر دیتا ہے۔ پھر تھوڑا تھوڑا نکال کر پانی سے گوندھتا ہے اور جلتے توے پر ڈال دیتا ہے۔ ہمارے پیٹ اور بیٹھ کو لوہے کے گرم گرم توے پر سینکتا ہے۔ ہم روتے چلاتے ہیں پر سب بے اثر۔ پھر ہمیں توڑ کر شوربے میں غوطہ دے اپنے دانتوں سے کاٹ کر ہمیں نگل جاتا ہے اور ہم اس کے پیٹ کی اندھیری کوٹھری میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس کا معدہ ہمارا رس چوس کر انسان کے لیے خون بناتا ہے اور ہمیں نکال پھینکتا ہے۔

وقت آ گیا ہے اس ظلم سے نجات پانے کا۔ یہ کہہ کر جلی روٹی بیٹھ گئی۔ سارا جلسہ تالیوں سے گونج اٹھا۔ اب کچوری بائی کھڑی ہوئی اور اپنی تقریر شروع کی۔

بھائیو اور بہنو! ہم سب کی اصلیت ایک ہے چاہے روٹی ہو یا چپاتی۔ پوری ہو یا کچوری۔ ہم سب اناج کے دانے ہیں۔ اس لیے ہم سب کو مل کر انسان کے ظلموں کے خلاف چھٹکارا پانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میری تجویز ہے کہ ہم ستیہ گرہ کریں۔ انسان کے پیٹ میں پہنچ کر گڑبڑ مچائیں اور ہضم نہ ہوں اس طرح وہ ہمیں کھانا چھوڑ دے گا اور ہم آزاد ہو جائیں گے۔

روغنی بیگم نے تجویز کی تائید کی لیکن ڈبل روٹی نے مذاق اڑایا۔

پارک کے ایک کونے میں کچھ شریر لڑکے چھپ کر یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے روٹیوں سے سجا مفت کا دسترخوان دیکھا تو جلسے کی طرف دوڑ پڑے۔ بھگدڑ مچ گئی۔ اب نتیجہ آپ خود سوچ لیں۔

(تعارف مئی 2021 کے شمارے میں شائع ہو چکا ھے)

■

Salma Yusuf Husain
E-52, Suncity
Sector 54
Gurugram- 122003 (Haryana)

دلجوئی

اقبال برکی

چاروں طرف جوش تھا، حوصلہ تھا، امنگ تھی۔ خوشی کا ماحول تھا۔ لیکن اس خوشی کے ماحول میں بھی اضطراب کی کیفیت شامل تھی۔ ایک خوف اور بدگمانی کی لہر تھی جو اس میں گھلی جاتی تھی۔ آج اسکول میں نتیجہ کا دن تھا۔ کوئی کامیاب ہونے والا تھا تو کوئی... وہ بچے جنھیں اپنی محنت، اپنی لگن اور اپنے شوق پر یقین تھا وہ تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ انھیں تو کامیاب ہونے کا بہرصورت یقین تھا لیکن ان کی اسی شادمانی کے آسمان پر کہیں کہیں خوف کے ایسے بادل بھی آجاتے کہ وہ کتنے نمبر سے اور کس درجے میں کامیاب ہوں گے۔ انھیں اپنی جماعت کے اچھے اور ذہین بچوں کے آگے آجانے کا خوف تھا۔ اسی طرح وہ بچے، جنھیں اپنی پڑھائی پر، اپنی محنت پر بالکل یقین نہیں تھا، وہ جانتے تھے کہ اپنی جماعت میں ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔ انھیں تو کامیاب ہونے کا بھی پورا یقین نہیں تھا۔ وہ بس امید و بیم کی درمیانی فضا میں ہچکولے کھا رہے تھے۔ حالانکہ نتیجہ دس بجے ظاہر ہونے والا تھا لیکن اسکول کمپاؤنڈ میں سات ساڑھے سات بجے سے ہی بچے آنے لگے تھے۔ کچھ بچے ٹولیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تو کچھ اپنے والدین اور سرپرستوں کے ساتھ آئے تھے۔ غرض کہ صبح سے ہی پورے میدان میں رونق تھی، ہلچل اور خوشی تھی جو چاروں طرف ناچتی پھرتی تھی۔

آخر دس بج گیا۔ اسکول کی طویل گھنٹی نے سب بچوں کو اپنی اپنی جماعتوں میں جانے پر مجبور کر دیا۔ اکرم بھی اب تک کبھی امید اور کبھی ناامیدی کے تھپیڑوں سے جوجھتا رہا تھا۔ وہ بھی اپنی جماعت کی طرف چل پڑا۔ اس کے اندر وہ اعتماد نہیں تھا جو دوسرے ہم جماعت بچوں میں نظر آتا تھا۔ وہ بھاری قدموں سے سب کے درمیان کمرے میں داخل ہوا اور پچھلی نشستوں میں سے ایک پر جا بیٹھا۔ ابھی تمام بچے اچھی طرح اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے بھی نہیں تھے کہ ان کے استاد کمرے میں داخل ہوئے۔ تمام بچوں نے ادب سے سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ استاد نے تمام بچوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا۔ محنت، شوق اور لگن سے پڑھنے لکھنے والے بچوں کی تعریف کی۔ ان کا حوصلہ بڑھایا اور آئندہ بھی اسی ذوق و

شوق سے پڑھائی لکھائی کرنے کی تاکید کی۔ اس کے بعد انھوں نے چند ایسے حوصلہ افزا کلمات ادا کیے جن سے ان بچوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی جو کامیاب تو ہوئے لیکن ان کے نمبرات کچھ کم آئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ان بچوں کی بھی دل جوئی کی کوشش کی جو ناکام ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی اس دلجوئی میں ناپسندیدگی بلکہ ایسے بچوں سے ناراضگی اور نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ بچے جو کمزور تھے اور جنھیں اپنی کامیابی کا بالکل یقین نہیں تھا ان کا تو دل ہی بیٹھ کر رہ گیا۔ اکرم بھی ان میں سے ایک تھا۔ اب تک تو وہ استاد کی طرف دیکھ رہا تھا، ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ اس کے دل و دماغ پر پتھر کی طرح برس رہا تھا۔ ان کے آخری جملوں نے تو اس کے اندر کا رہا سہا سکون اور حوصلے کے ٹیلے کو بھی ڈھا کر رکھ دیا۔ اب وہ ان کی طرف دیکھنے کے بجائے نیچے اپنے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک انجانا سا خوف اسے اندر ہی اندر پریشان کر رہا تھا۔ وہ اسی جماعت میں اب شاید دوسری مرتبہ...

اور اکرم اس کے آگے نہیں سوچ سکا۔ استاد نے بچوں کا نتیجہ تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ اسلم، شیرین، جمشید، نہال، رخسار، صدام جیسے بچے تھے جن کے نتیجوں کی انھوں نے خوب تعریف کی۔ انھیں شاباشی اور مبارک باد دے کر ان کے نتیجے ان کے ہاتھوں میں دیے۔ اس کے بعد جماعت کے دیگر بچوں کے نتیجے بھی انھوں نے خوش ہو کر تقسیم کیے۔ لیکن... لیکن جب اکرم کا نمبر آیا تو ان کے چہرے کا تاثر ایسا بدلا کہ اکرم صرف ایک بار ہی دیکھ سکا اور دوسری مرتبہ ان کی طرف دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ انھوں نے اس کا نتیجہ ہاتھ میں دینے سے پہلے کہا، ''اکرم میاں ... بس یہی ایک نتیجہ ایسا ہے جو میرا منہ چڑاتا ہے!'' اتنا کہہ کر انھوں نے نتیجہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اکرم نے صرف ایک اچٹتی اور سرسری نگاہ اپنے نتیجے پر دوڑائی۔ جو چیز سب سے پہلے اسے نظر آئی، وہ سرخ روشنائی تھی۔ دو جگہوں پر سرخ روشنائی سے کچھ لکھا گیا تھا۔ کیا...؟ اسے نہ اکرم دیکھنا چاہتا تھا اور نہ پڑھنا۔ اس کا دل تو اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ نتیجہ لے کر وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسکول کمپاؤنڈ سے نکل کر بچوں کے ہمراہ وہ کچھ دور تک تو چلتا رہا۔ مگر ایک جگہ سے وہ دوسرے راستے پر گھوم گیا۔ کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں دی کیوں کہ ہر کوئی اپنے آپ

میں مگن تھا۔ اکرم مایوس تھا۔ اس کے اندر ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنا نتیجہ دیکھ سکے یا پھر اپنے ابو اور امی کا سامنا کر سکے۔ وہ گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ گھر نہیں جائے گا۔ وہ ایسا نتیجہ لے کر گھر نہیں جائے گا۔ وہ اپنے ابو کی ڈانٹ پھٹکار اور ان کی مار نہیں کھائے گا۔

وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ شہر اور آبادی تو کب کی پیچھے چھوٹ چکی تھی۔ وہ چلتا ہی رہا۔ وہ ایک ایسے ویرانے جنگل سے گزر رہا تھا جہاں کبھی کبھی شکاری، پرندوں کا شکار کرنے آتے تھے۔ بہت دنوں پہلے، ایک مرتبہ وہ اپنے محلے کے چند شکاریوں کے ہمراہ ادھر آ چکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بہت دور پر اس جنگل میں ایک نیا گھر بنا ہوا ہے۔ گھر دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ یہاں تو کوئی گھر نہیں تھا۔ ایسے جنگل اور ویرانے میں کس کا گھر ہے؟ اس نے سوچا چلو چلتے چلتے اس کو بھی دیکھ لیں اور پھر اس کے بھی آگے چلے جائیں گے۔ گھر نہیں جانا ہے تو پھر کہیں بھی چلو... کہیں بھی، کسی بھی طرف۔

یہی سب سوچتے، ادھر ادھر دیکھتے اپنا نتیجہ ہاتھ میں لیے، لاپرواہی سے جھلاتے آخر وہ اس نئے گھر کے قریب بھی پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ گھر بہت شاندار، بڑا اور اونچا ہے۔ اس کا رنگ بھی بہت اچھا اور دلکش ہے۔ لیکن اس کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس اونچے، بڑے اور خوبصورت گھر کے باہر ایک نہایت حسین اور جوان عورت کھڑی ہے اور اسے ہی دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں گہری نیلی اور خوبصورت تھیں۔ اکرم نے ایسی آنکھوں والی عورتیں صرف تصویروں میں دیکھی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

اسے مسکراتا دیکھ کر اکرم بھی مسکرا پڑا۔ آخر جب اور نزدیک پہنچا تو عورت نے اشارہ کر کے اسے اپنے قریب بلایا۔ وہ بولی، ''کہاں جا رہے ہو؟''

اکرم چپ رہا۔ اس کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد اس خوبصورت عورت نے ویسی ہی محبت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دوبارہ اس سے پوچھا، ''ارے آج تو اسکول کا نتیجہ تھا۔ یہ تمھارے ہاتھ میں نتیجہ ہی ہے نا؟ لاؤ تو دیکھوں ذرا۔'' کہتے کہتے اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔

لاشعوری طور پر اکرم کا ہاتھ بھی اٹھا اور بغیر کچھ کہے اپنا نتیجہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس خوبصورت، جوان عورت نے ایک نگاہ اکرم کے نتیجے پر ڈالی اور پھر بڑی محبت سے تعریف کرتی ہوئی بولی، ''ارے واہ! تم تو کامیاب ہو گئے ہو۔ اکرم نام ہے۔ واہ نتیجہ تو بہت اچھا ہے! صرف حساب میں کچھ کمزور ہو۔ لیکن دوسرے مضامین میں تو بہت اچھے نمبرات آئے ہیں۔ ارے منہ میٹھا کراؤ۔ واہ کیا نتیجہ ہے! شاباش!!'' لیکن کچھ دیر بعد حیرت سے بولی، ''مگر اکرم... تم ادھر کہاں جا رہے ہو؟ تمھارا گھر کدھر ہے؟''

اب معلوم نہیں اکرم کو کیا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا نتیجہ لیا اور صرف بایاں ہاتھ اُٹھا کر اپنے پیچھے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا، ''اُدھر۔''

عورت نے اسے دیکھا اور پھر بغیر کچھ کہے اپنے گھر کے اندر چلی گئی کیوں کہ اندر سے کسی نے اسے آواز دی تھی۔ اکرم وہیں سے پیچھے مڑا۔ گھر پہنچنے میں کتنی دیر لگی، اسے نہیں معلوم۔ لیکن اسے یہ ضرور معلوم ہے کہ اس کے بعد اپنا نتیجہ لے کر اسے پھر کبھی جنگل میں نہیں جانا پڑا تھا۔

(تعارف ستمبر 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ھے)

■

Dr. Iqbal Barki
155 MHADA, Noor Bagh
Malegaon-423203Distt: Nasik(MS)
Mob: 8329273266

شرط

محمد طارق

اماوس کی سیاہ رات تھی۔ دیہات کا سارا ماحول جیسے ٹھٹھر گیا تھا۔ ویسے بھی دیہاتوں میں شہر کی سی رونقیں نہیں ہوتیں اور نہ وہ تفریح گاہیں جن پر سناٹا فوراً غالب نہ آسکے اس لیے دیہات کو رات ہوتے ہی سناٹا اس طرح نگل جاتا ہے جیسے ٹراتے مینڈک کو سانپ۔

ہاں گرمی کے دنوں میں نو، دس بجے رات تک دیہات میں کچھ چہل پہل رہتی ہے لیکن سردیوں میں تو شام ڈھلتے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہوجاتے ہیں اور بستروں میں دبک جاتے ہیں۔

آج بھی ان تینوں کے علاوہ تقریباً دیہات کے سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں تھے اور وہ تینوں حسب معمول چوپال کے سامنے کوڑا کرکٹ، گھاس پھوس کا الاؤ جلاتے ہوئے دہکتی آگ کے گرد اطمینان سے بیٹھے تھے۔

ان تینوں میں ایک کی کلائی پر گھڑی بندھی تھی۔ چمکیلے ڈائل والی مستطیل نما گھڑی۔ وہ بار بار گھڑی میں ٹائم دیکھ رہا تھا... انھیں رات بارہ بجے کا انتظار تھا۔ رات ٹھیک بارہ بجے ان تینوں میں سے ایک آدمی شرط پوری کرنے والا تھا جو کل اس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے باندھی تھی۔

شرط باندھنے والا پٹھانی لباس میں ملبوس تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں سے عمر میں چھوٹا تھا۔ لیکن لحیم شحیم اور دراز قد کی وجہ سے دونوں سے بڑا لگتا تھا۔ اس کے چوڑے چکلے چہرے پر مونچھیں اتنی گھنی تھیں کہ اس کے ہونٹ مونچھوں میں تقریباً چھپ گئے تھے۔

اس کا نام دلیر خان تھا اس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے وہ ساری شرطیں جیت لی تھیں جو انھوں نے اس سے باندھی تھیں جیسے بھینس کو گرانے کی شرط... چار درجن کیلے ایک ہی وقت میں کھانے کی شرط... ایک مکے میں ناریل پھوڑنے کی شرط، وزن اٹھانے کی شرط وغیرہ۔

اس نے کل جو شرط اپنے ساتھیوں سے باندھی تھی اس کا تذکرہ اپنی نئی نویلی دلہن سے بھی کردیا تھا۔ اس کی بیوی شرط سن کر خوف زدہ ہوگئی تھی۔

''ایسا مت کیجیے۔ تمھیں میری قسم! اس نے دلیر خان کے مضبوط چوڑے چکلے شانوں کو اپنے نازک ہاتھوں سے پکڑ کر کہا تھا ''کیا ملے گا تمھیں شرط پوری کرکے۔''

''پانچ سو روپے ملیں گے اور میرا نام ہوگا۔''

''کیا رکھا ہے ایسے نام اور روپے میں'' اونہہ! آپ کی جان کو اگر کچھ ہوگیا تو...'' اس کی بیوی منہ بسورتے ہوئے بولی۔

''ہشت! ایسی باتیں نہیں کرتے، تم دلیر خان کی بیوی ہو، تمھیں اپنے شوہر کی طرح نڈر رہنا چاہیے۔'' دلیر خان نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا جس میں خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔

''نام اور روپے کے لیے دنیا کے لوگ کیا کچھ نہیں کر گزرتے، تم چار دیواری میں رہنے والی عورت کیا جانو، میں نے تو صرف ایک معمولی شرط اپنے دوستوں سے باندھی ہے۔ لوگ تو اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔''

''تم بھی تو اپنی زندگی...!'' بیوی کانپتی آواز میں بولی۔

دلیر خان نے جھٹ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا، گھبراؤ مت....! مجھے کچھ نہیں ہوگا، میں اپنی شرط پوری کرکے ان افواہوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کردوں گا جو برسوں سے لوگ گاؤں میں پھیلا رہے ہیں اور

عرصے سے لوگ شام ہوتے ہی اس راستے سے گزرتے ہوئے ڈرنے لگے ہیں...، میں اس راستے کو بے خطر بنا دوں گا۔ کیا یہ ایک نیکی کا کام نہیں ہوگا؟!''

''ہوں۔۔۔!'' ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی بیوی نے اپنا سر جھکا لیا۔

اس کے لبوں سے نکلا ''ہوں'' سینے کی سرد سانسوں سے بھرا ہوں'' لاچاری اور بے بسی کے جذبات سے کراہتا ''ہوں'' دلیر خان نے اس ''ہوں'' کو سنا، سمجھا اور اپنی بیوی سے کہا ''گھبراؤ مت، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''

دلیر خان نے اپنی بیوی سے فیصلہ کن انداز میں کہہ تو دیا تھا کہ ''مجھے کچھ نہیں ہوگا'' لیکن جب اس کا ساتھی بارہ بجے کے انتظار میں گھڑی دیکھ رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں اور وہ برسوں پرانا قصہ اسے ایسے یاد آ رہا تھا جیسے بات کل ہی کی ہو۔ کل ہی گاؤں کے ایک بہادر اور دلیر شخص کو آبادی سے دور شمشان کے قریب اس بوڑھے املی کے درخت کے نیچے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا۔

اس املی کے درخت کو لوگ ''مانس مار'' کے نام سے جانتے ہیں اور اس کے تعلق سے خوف زدہ باتیں لوگوں کے کانوں میں محفوظ ہیں۔

دلیر خان ان باتوں کو جنھیں وہ افواہ سمجھا کرتا تھا، آج ان باتوں میں جانے کیوں اسے کچھ حقیقت بھی لگنے لگی تھی۔

املی کے پیڑ پر وہ شخص بھوت بن کر رہتا ہے اور اماوس کی رات میں درخت سے اتر کر اس درخت کے نیچے سے گزرنے والے ہر آدمی، عورت کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتا ہے۔

ابھی تک اس بھوت نے کتنے آدمیوں اور عورتوں کو مارا؟ میرے علم میں تو ابھی تک ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے کہ املی کے درخت کے نیچے بھوت نے کسی کو مار ڈالا ہو، دلیر خان سوچ رہا تھا... اور اس کا ایک ساتھی بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا، اسے رات کے بارہ بجے کا انتظار تھا۔

دلیر خان نے سوچ کر اپنے ساتھیوں سے پوچھا ''گاؤں کی کسی عورت یا مرد کا نام تو بتاؤ بھلا جسے املی کے پیڑ کے بھوت نے مار ڈالا ہو؟''

اس کے دوستوں نے لاعلمی ظاہر کی لیکن وثوق سے یہ بھی کہا کہ ''مانس مار'' درخت پر ایک بھوت ہے، گاؤں کا ہر شخص جانتا ہے کہ بھوت اماوس کی رات میں درخت سے اتر کر نیچے آتا ہے اور درخت کے آس پاس گھومتا رہتا ہے، شکار کی تلاش میں...

دلیر خان نے اپنے ساتھیوں کی باتیں سنیں، اندر ہی اندر وہ تھوڑا خوف زدہ بھی ہونے لگا... مگر اس نے شرط باندھ لی تھی۔ شرط توڑنا اس کے لیے بزدلی کی علامت تھی اور وہ اپنے ساتھیوں میں دلیر بن کر رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے ساتھیوں کی خوف زدہ کرنے والی باتیں سن کر ''اوں۔۔۔'' کہا۔

اس کا ایک ساتھی اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا... الاؤ کی آگ سرد ہو رہی تھی... دوسرا ساتھی پاس پڑا ہوا کوڑا کرکٹ آگ میں ڈال کر آگ دہکانے کے لیے پھونک مار رہا تھا۔

گھڑی والے ساتھی کی نگاہیں گھڑی کے ڈائل پر جمی ہوئی تھیں، جیسے ہی گھڑی کے گھنٹے اور منٹ کی سوئیاں بارہ پر جمع ہوئیں وہ بولا ''بج گئے بارہ، لو یہ کھونٹی، اسے املی کے اس درخت کے نیچے گاڑ آؤ جہاں بھوت رہتا ہے۔ ہم علی الصبح آ کر دیکھیں گے، کھونٹی زمین میں گڑی دیکھ کر تمھیں شرط کے پانچ سو روپے دیں گے... اگر کھونٹی زمین میں گڑی نہیں ہوگی تو تمھیں پانچ سو روپے ہمیں دینا ہوگا۔

دلیر خان نے کھونٹی لی، اس کا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ خوف و دہشت جانے کیسے اس پر سوار ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اس کا

دل کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ منہ کا پانی سوکھ کر جانے کہاں چلا گیا تھا۔ زبان بار بار تالو سے چپک رہی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس راستے پر چل پڑا تھا جو املی کے پیڑ کو جاتا ہے۔

سوئیوں جیسی چبھنے والی سرد ہوا کے جھونکے اس کے بدن کو چھیڑ رہے تھے۔ مگر اس کا بدن پسینے سے چپچپا رہا تھا۔ حلق سوکھ گیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے حلق میں کانٹے اگ آئے ہوں۔

راستہ چلتے چلتے اس نے کھونٹی ٹھونکنے کے لیے ایک پتھر اٹھا لیا تھا۔

سیاہ رات میں اسے دور املی کا درخت ایسا نظر آ رہا تھا جیسے قوی ہیکل دیو کھڑا ہو۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، رات کے اندھیرے میں سیاہ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے ڈراؤنی صورت پیش کر رہے تھے... اسے اپنا دل سینے کی بجائے سر میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا...

وہ جیسے ہی املی کے درخت کے قریب پہنچا ایک لمحے کے لیے اس کا جی بے اختیار چاہا کہ وہ کھونٹی پھینک کر واپس پلٹ جائے اور دوڑتا ہوا اپنے گھر چلا جائے، مگر اسے وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جو اس نے اپنی بیوی سے کی تھیں— وہ بہادری اور دلیری کی باتیں... غرض وہ خوف زدہ املی کے پیڑ کے نیچے پہنچا اور سرعت سے کھونٹی زمین میں گاڑنے لگا۔ کھونٹی گاڑتے گاڑتے وہ چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا...

چاروں طرف مہیب اندھیرا تھا اور جھینگروں کی آواز سناٹے میں ایک عجیب شور پیدا کر رہی تھی، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ جھینگروں کی آوازیں نہ ہوں، بھوت پریت کی چیخیں ہوں... دہشت ناک چیخیں...

کھونٹی گاڑ کر جیسے ہی اٹھا دوسرے ہی لمحے دھم سے منہ کے بل گرا جیسے زمین نے اس کا دامن پکڑ لیا ہو۔

علی الصبح جب دلیر خان کے دوست املی کے پیڑ کی طرف گئے تو انھوں نے دلیر خان کو پیڑ کے نیچے اوندھا پڑا ہوا دیکھا۔

''دلیر خان—!'' دونوں دوست ایک ساتھ دلیر خان کو پکارتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔ جیسے ہی اسے چت کیا، چیونٹیوں کی ایک قطار اس کے منہ سے نکلی اور اس کی وحشت زدہ، پھٹی پھٹی بے نور آنکھیں انھیں تکتے جا رہی تھیں...

دلیر خان کی لاش دیکھ کر اس کے دونوں دوستوں کے پاؤں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے... پھر ان کی نظر زمین میں گڑی کھونٹی پر جم گئی... کھونٹی دیکھ کر انھیں دلیر خان کی موت کا سبب معلوم ہو گیا۔

دلیر خان کے قمیص کا دامن کھونٹی کے ساتھ زمین میں گڑ گیا تھا۔

''دلیر خان واقعی بہادر اور نڈر آدمی تھا یار—! لیکن خوف و دہشت کے ماحول نے اسے مار ڈالا۔

اگر کھونٹی کے ساتھ اس کا دامن نہ گڑ جاتا تو وہ شرط جیت گیا ہوتا۔''

''ہاں—، اب چلو بھاگو... اپنے پانچ سو روپے بچ گئے!''

''ہاں، چلو!''

دلیر خان کے دونوں دوست اس کی لاش کو وہیں چھوڑ کر تقریباً بھاگتے ہوئے گاؤں کی طرف چل پڑے...

(تعارف جنوری 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Mohd Tarique
Inamdar House
Post: Kholapur
Dist.: Amravati - 444802 (Maharashtra)
Mob.: 8055503366

کہانی

عادل حیات

ایک سے بھلے دس

وہ چار بھائی تھے۔ چاروں پڑھنے لکھنے میں جتنے تیز تھے، شرارت بھی اتنی ہی کرتے۔ ان کی اودھم چوکڑی سے امی بہت پریشان تھیں۔ بسا اوقات تو ایسا گتھم گتھا ہوتے کہ شیطان بھی پناہ مانگنے لگتا۔ گھر میں چین وسکون نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اسکول چلے جاتے تو امی کے جان میں جان آتی۔ اسکول میں موسمِ سرما کی چھٹی ہوگئی تھی۔ بچے چھٹی منانے کے لیے والدین کے ساتھ گاؤں جارہے تھے۔ وہ خوش تھے کہ گاؤں میں دادا اور دادی سے عرصے بعد ملنے کا موقع ملے گا۔ دادی تو خیر ان کو اپنے سینے سے چمٹائے رہتی تھیں اور دادا روز انھیں نئی نئی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ٹرین اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرے مناظر آتے اور پلک جھپکتے ہی اوجھل ہوجاتے۔ بچے ان مناظر میں کھوئے اپنی آنکھوں میں گاؤں کے سپنے سجائے اپنی اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ خموشی طویل ہونے لگتی تو ان میں ایک دوسرے کو چھیڑ دیتا اور شروع ہوجاتی اودھم چوکڑی۔ امی اور ابو انھیں شانت کرانے کی کوشش کرتے، لیکن وہ کسی کے دام میں کب آنے والے تھے۔ تھک ہار کر خود ہی چپ ہو بیٹھتے۔ اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ دوسرے دن صبح تقریباً ساڑھے چھ بجے ٹرین اسٹیشن پر پہنچی اور وہ ٹیکسی پر بیٹھ کر گاؤں کے لیے چلے گئے۔

گاؤں میں ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ ان کی پسند کے مطابق دادی نے ڈھیر سارے کھانے بنائے تھے۔ وہ بھوکے تو تھے ہی کھانوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے بعد تھوڑا آرام کیا اور پھر سیر سپاٹے کی باری آئی۔ وہ گاؤں میں دیر تک گھومتے رہے۔ کئی لوگوں نے انھیں پیار کیا اور اپنے گھر لے جاکر اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیں۔ واپسی پر وہ بہت ہی مگن چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے گھر آرہے تھے کہ آپس میں لڑائی ہوگئی۔ یہ لڑائی اتنی بڑھی کہ گاؤں کے لوگوں کو درمیان میں آنا پڑا۔ اس جھگڑے کا پتہ دادا جی کو چلا تو انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے نہ سمجھنے کی قسمیں کھا رکھی تھی۔ کسی بھی طور نہیں سمجھے۔ آخر کار تھک ہار کر دادا نے ایک کہانی سنانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے بچوں سے کہا کہ پہلے منہ ہاتھ دھوکر رات کا کھانا کھالیں۔ اس کے بعد کہانی سننے کے لیے واپس میرے پاس آجائیں۔ ان کی باتیں سُن کے بچے گھر کے اندر داخل ہوگئے اور تقریباً گھنٹے بھر بعد آکر دادا کے لحاف میں دبک گئے۔ دادا جی نے پہلے تو ان سے شہر کے بارے میں بہت سی باتیں کیں، پھر بچوں سے ایک سے نو تک پڑھ کر بتانے کو کہا۔ بچوں نے ایک ہی سانس میں ایک سے نو تک کی گنتی سنادی تو دادا جی نے انھیں شاباشی دیتے ہوئے پوچھا:

”بچو!...... ایک سے نو کیا ہیں۔“

”جی دادا جی ...... یہ سب گنتی ہے۔“

دادا جی کے سوال کو سن کر بچوں نے ایک ہی سانس میں کہا۔ انھیں تعجب ہو رہا تھا کہ آج دادا جی اتنے آسان سوال کیوں پوچھ رہے ہیں۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ دادا جی کے مشکل سوالات ہمیں پریشان کردیا کرتے تھے، لیکن دادا جی ان کا خود جواب دیتے تو ہمیں مزہ بھی خوب آتا تھا۔ دادا جی نے ان کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا:

''ہاں تم نے سہی کہا...... ویسے یہ گنتی کے حرف ہیں لیکن ہیں آپس میں بھائی۔''

''جی دادا جی ...... ہم جانتے ہیں۔''

چاروں بھائیوں نے پھر سے ایک ساتھ جواب دیا تو دادا جی نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہانی اس طرح شروع کی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ بڑا بھائی یعنی نو نے اپنے چھوٹے بھائی آٹھ کو تھپڑ مار دیا۔ جس کی آواز دور تک گونج گئی۔ آٹھ نے نو سے پوچھا کہ بھائی تم نے مجھے تھپڑ کیوں مارا تو نو نے جواب دیتے ہوئے کہا:

''میں تم سے بڑا ہوں..... اس لیے تھپڑ مارا ہے۔''

اس کا جواب سن کر آٹھ نے چھوٹے بھائی سات کے گال پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ پڑتے ہی سات کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے اپنے گال کو سہلاتے ہوئے آٹھ سے پوچھا:

''بھائی تم نے مجھے کیوں مارا۔''

جواب دیتے ہوئے آٹھ نے وہی باتیں دہرا دیں جو اس سے تھوڑی دیر پہلے نو نے کہی تھی۔ یہ بات سن کر سات نے اپنے چھوٹے بھائی چھ کو تھپڑ مارا اور وہی باتیں دہرا دی جو اسے آٹھ نے کہی تھی۔ اس طرح تھپڑ مارنے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ چھ نے پانچ کو پانچ نے چار کو چار نے تین کو تین نے دو کو اور دو نے ایک کو زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ ان سے وجہ پوچھی گئی تو سبھوں نے وہی جواب دیا جو نو نے آٹھ کو دیا تھا۔ تھپڑ کھانے کے بعد پہلا دوسرے سے اپنی بھڑاس نکال لیتا، لیکن ایک کے بعد کوئی حرف بچا نہیں تھا۔ اس سے چھوٹا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنی بھڑاس نہیں نکال سکا۔ اس کے سامنے زیرو تھا، جس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک اپنا سوجا ہوا گال سہلاتا اور زیرو کو گھورتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سبھوں نے دیکھا کہ ایک کھسکتا ہوا زیرو کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی اس حرکت پر سبھی ہنستے ہوئے آپس میں بات کرنے لگے:

''بھلا بتاؤ...... وہ زیرو کو تھپڑ کیسے مارے گا۔''

ان کے ہنسنے اور طنزیہ لہجے کا ایک پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنی دھن میں چلتا ہوا زیرو کے قریب پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھا لیا۔ ایسا کرتے ہی ایک کی طاقت دس گنی ہو گئی۔ اس کے بڑے بھائیوں کے درمیان کھلبلی مچ گئی۔ وہ ایک کی بڑھی طاقت سے خوف زدہ ہو گئے۔ انھیں حیرانی تھی کہ دبلا پتلا بال دیکھنے میں ہم سے کمزور اپنی عقلمندی اور ہوشیاری سے دس گنا طاقت ور بن گیا۔ انھیں اپنی بیوقوفی اور لڑنے جھگڑنے کی عادتوں پر بھی افسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچتے رہے تھے کہ کاش ہم آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کر کے ایک دوسرے کو پیار سے گلے لگاتے تو آج ہماری طاقت بہت زیادہ ہوتی۔ وہ سوچتے سوچتے خود پر ہی پیچ و تاب کھانے لگے۔

دادا جی نے کہانی ختم کر کے باہر دیکھا۔ چاند کی روشنی اندھیرے کو چیرتی ہوئی ہر چیز کو روشن کیے ہوئے تھی۔ بچے اپنے کان لگائے غور سے کہانی سن رہے تھے۔ جب دادا جی نے کہانی ختم کی تو بچوں کے چہروں پر پچھتاوے اور آنکھوں میں ایک نئے ارادے کے آثار نمایاں تھے۔ دادا جی نے ان کا چہرہ پڑھ لیا اور اپنی کامیابی پر مسکراتے ہوئے کہا:

''بچو!..... رات زیادہ ہو گئی ہے...... جا کر سو جاؤ...... ان شاء اللہ کل ملاقات ہو گی۔''

سبھی بچوں نے دادا جی کو خدا حافظ کہا اور ایک مصمم ارادے کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اپنے اپنے بستروں پر جا کر سو گئے۔

(تعارف ستمبر 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Adil Hayat
S-11/11, 2nd Floor
Neat- Riyan Pubalic School
Jogabai Extention, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

محمد مطیع اللہ نازش کنگی

جنتر منتر کا کرشمہ

مہاندی کے کنارے سال گرام یعنی ساگوان کے گھنے جنگل میں ایک کٹیا تھی، جس میں منوج نامی سادھو رہا کرتا تھا، وہ منتر جنتر خوب جانتا تھا۔ دور دراز سے لوگ اس کے پاس آتے اپنی پریشانی بیان کرتے، جھاڑ پھونک کرواتے، جڑی بوٹی بیمار لوگ لیتے، اس طرح وہ اس علاقے میں بڑا ہی مشہور سادھو تھا۔

مگر اکثر وہ دکھی رہا کرتا تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی، اس کی بیوی اس کو ہر دم طعنہ دیتی تھی۔ لا اولاد ہونے کی وجہ سے غمگین رہا کرتی تھی۔ یہ بہت پرانی کہانی ہے کہ وہ ایک دن مہاندی سے غسل کر کے آیا اور تپسیا میں بیٹھ گیا۔ منتر جنتر کے ذریعے عجیب عجیب کرشمے کیا کرتا تھا۔ جب تپسیا میں بیٹھا تھا اچانک ایک چوہیا چھپر سے نیچے اس کے ہاتھ پر گری، وہ چوہیا، مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی، سادھو نے دیکھا سورج کی کرن میں چمک رہی ہے، دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی ہے۔ اس کو ہاتھ میں لے کر سادھو نے سوچا کہ ایشور اس چھوٹی سی جان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ باز کے منہ سے پھسل کر گرتی وہ بھی میرے ہاتھ میں؟ جب یہ میرے ہاتھ میں گری ہے میں اس کو رکھوں گا پال پوس کروں گا۔ سادھو کو اس پر رحم آیا، اس وجہ سے اس کو منتر جنتر کے ذریعے ایک لڑکی کی شکل وصورت میں تبدیل کر دیا۔

سادھو اس لڑکی کو لے کر گھر گیا اور اپنی بیوی کے گود میں دے کر کہا ”تم بچے کی تمنا کرتی تھی؟ یہ لو ایشور نے یہ لڑکی ہم کو دی ہے۔“

سادھو کی بیوی پورا واقعہ سن کر بہت خوش ہوئی اور اپنی اولاد کی طرح اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

وہ لڑکی باپ ماں کی دلاری اور آنکھ کا تارا بن گئی۔ وہ جس وقت جو کچھ مانگتی، سادھو اس کو لا کر مہیا کر دیا کرتا۔ دھیرے دھیرے وہ لڑکی ہوشیار ہوگئی۔ اس کی طرح خوبصورت

لڑکی اس علاقے میں کوئی اور نہیں تھی۔ ایک دن سادھو جی نے اپنی بیوی سے کہا، کہ ''لڑکی کی شادی کی عمر ہو چکی ہے۔ ایک اچھا سا قابل لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کرنا ہے۔ جو سب سے بڑا اور قابل لڑکا ہوگا اسی سے اپنی لڑکی کی شادی کریں گے۔ تمھاری کیا رائے ہے؟

سادھو کی بیوی بھلا منع کیسے کرتی یہ تو ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے؟ تب سب سے بڑا کون ہے؟ دونوں کے درمیان صلاح مشورہ شروع ہوا اور دیر تک صلاح مشورہ ہوتا رہا سادھو نے کہا، ''میری رائے میں سورج سب سے بڑا ہے، کیونکہ وہ دنیا کو روشنی دیتا ہے اس کی روشنی سے ہر چیز کو فائدہ ہوتا ہے۔ ہماری لڑکی سورج سے شادی کرے گی۔''

سادھو جی کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں تھی اس کو منتر جنتر کا علم تھا۔ اس نے سورج کو منتر جنتر کے ذریعے طلب کیا۔ سورج فوراً سامنے آکھڑا ہوا۔ سورج نے پوچھا، ''سادھو جی مجھے آپ نے کیوں بلایا؟''

''سادھو جی نے کہا کہ میری ایک نہایت ہی خوبصورت لائق اور قابل لڑکی ہے۔ اس کی شادی تمھارے ساتھ کرنے کا خیال ہے'' سورج کے جواب دینے سے پہلے لڑکی نے کہا ''نانانا! میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ ان کا بدن بڑا گرم ہے؟ ان کے پاس رہنے سے میں جل کر راکھ ہو جاؤں گی۔ اس سے اور کوئی اچھا ہے وہ دیکھو۔''

سادھو جی کو یہ بات بری لگی اس لیے کہ انھوں نے جس کو سب سے بڑا اور اچھا سوچا تھا، لڑکی نے اس کو پسند نہیں کیا۔ اب میں کیا کروں گا؟ اب کس کو اس کے لیے دولہا ٹھیک کروں گا؟ ''سورج سے پوچھا تم سے بڑا کون ہے''

سورج نے کہا ''بادل اور میگھ مجھ سے بڑا ہے۔ جب وہ میرے منھ کے سامنے آجاتا ہے تو میں کرن کو دنیا پر پھینک نہیں سکتا'' یہ کہہ کر سورج چلا گیا۔ اس کے بعد سادھو جی نے میگھ اور بادل کو طلب کیا۔ میگھ فوراً آ گیا تو اس کو اپنی لڑکی سے شادی کی بات کہی۔ میگھ اور بادل کے جواب سے پہلے لڑکی نے کہا ''نہیں ابا نہیں، اس کالے کلوٹے دولہے سے میں شادی نہیں کروں گی۔''

سادھو جی یہ سن کر بہت پریشان ہو گئے۔ میگھ اور بادل سے، پوچھا کوئی اور بڑا ہے تو اس نے کہا ''ہوا مجھ سے بڑی ہے وہ جدھر چاہتی ہے مجھے اڑا کر لے جاتی ہے۔''

اس کے بعد اب ہوا کی باری آئی۔ سادھو کے بلانے پر وہ بھی آکھڑی ہوئی۔ اس کو دیکھتے ہی لڑکی نے کہا ''نابابانا، یہ جناب پوری دنیا کا چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے بے چین دولہا سے میں شادی نہیں کروں گی۔''

سادھو جی نے یہ سن کر لمبی سانس لی اور تھک ہار کر بیٹھ

گئے۔ سورج، میگھ، بادل اور ہوا، جب یہ سب پسند نہیں تو اب کس کو بلاؤں گا؟ سادھو جی بڑی فکر میں پڑ گئے ان کے علاوہ کون بڑا ہوگا، کیا میری لڑکی غیر شادی شدہ رہ جائے گی؟ تلملا کر سادھو جی نے ہوا سے پوچھا ''کیا تم سے کیا کوئی بڑا ہے؟ ہوا نے کہا ''ہاں پربت مجھ سے بڑا ہے۔ میں سب کو اڑا سکتی ہوں لیکن پہاڑ کو اپنی جگہ سے ایک انچ ہٹا نہیں سکتی۔''

یہ سن کر مایوس سادھو جی کی جان میں جان آئی اور امید کی کرن نظر آئی۔ کیا پتہ لڑکی اس کو بھی پسند کرے گی یا نہیں۔ پھر بھی اس نے پربت کو بلایا اور وہ حاضر ہوا۔ سادھو نے اس سے پوچھا ''کیا میری لڑکی سے شادی کرو گے؟ میں نے اسی لیے تم کو بلایا ہے۔'' ابھی سادھو کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ لڑکی نے کہا ''ارے باپ رے باپ! یہ اتنا سخت، اتنا اونچا! میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ نا بابا نا، اس کے علاوہ دیکھو اور کون بہتر ہوگا۔''

یہ بات سن کر سادھو جی کی عقل گم ہوگئی۔ وہ تھک ہار کے بیٹھ گئے۔ لڑکی کے لیے ایک اچھا اور قابل دولہا تلاش کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا مگر آج کے دور میں ایک اچھی نیک سیرت بہو، دلہن پانا پہاڑ کاٹ کر نہر لانے کے برابر ہے۔ پربت کو بھلا کوئی کیوں کر پوچھے گا؟ کیا میں اسی طرح ایک ایک کو بلاتا رہوں گا! بڑے شرم کی بات ہے کہ لڑکی ہر ایک کو یوں ناپسند کرتی ہوئی شادی سے انکار کرتی ہے اور منہ موڑ لیتی ہے۔ پھر سادھو جی نے سوچا، اور ایک بار کوشش کی جائے لڑکی کی شادی تو کرنی ہی ہے۔ یہ سوچ کر پہاڑ سے پوچھا کہ ''کیا تم سے بھی کوئی بڑا ہے؟''

پربت نے کہا ہاں سادھو جی! چوہا مجھ سے، بھی بڑا ہے۔ میں جتنا بھی سخت کیوں نہ رہوں لیکن وہ بل اور سوراغ اپنے رہنے کے لیے بنا ہی لیتا ہے۔ اس وقت تک سادھو جی تنگ آ چکے تھے۔ اچھا یا برا کچھ فیصلہ لینے کی ان میں سکت نہیں تھی۔ سادھو جی نے فوراً منتر جنتر کے ذریعے چوہا کو طلب کیا۔ چوہا سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کو دیکھ کر سادھو جی کی لڑکی خوشی کے مارے کھلکھلا اٹھی، ''ہاں بابا! یہی دولہا ٹھیک ہے۔ میں اس سے شادی کر کے شاد و آباد رہوں گی''

سادھو جی نے غور کیا، کہ انھوں نے منتر جنتر کے بل پر ایک چوہا کو انسان اور لڑکی کے روپ میں تبدیل کر دیا۔ مگر اس سے اس کی فطرت نہیں بدلی، فطرت کبھی نہیں بدلتی مشہور کہاوت ہے ''جبل گردد جبلت نہ گردد'' پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے پر فطرت نہیں بدلتی۔ ان کی لڑکی گرچہ شکل وصورت میں انسان ہے مگر اس کی حقیت چوہیا ہی ہے۔ وہ کس طرح سورج دیوتا سے شادی کر سکتی تھی؟ بہرحال اس نے ٹھیک اپنا جیون ساتھی چنا ہے۔

اس طرح سادھو جی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا منتر جنتر کے بل بوتے پر کچھ بھی بنا لیا جائے مگر یہ حقیقت نہیں، حقیقت اور فطرت خدا نے جس کو جو بنائی ہے اس کو کوئی نہیں بدل سکتا سادھو جی نے منتر جنتر کے ذریعے لڑکی کو چوہیا بنا دیا۔ وہ چوہا اور چوہیا دونوں خوشی خوشی جنگل کی طرف چلے گئے۔ انسان، حیوان، چرند، پرند ہر ایک کی نسل جدا جدا ہے۔ ہر ایک کا جوڑا بھی قدرت نے پیدا کیا ہے۔ ہر مخلوق اپنے اپنے جوڑے کے ساتھ خوش رہ سکتا ہے، اسی کے ذریعے ہر ایک نسل کی افزائش بھی ہوتی ہے۔ یہی نظام خداوندی ہے۔

(تعارف مئی 2022 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Mohd Moteeullah Nazish
D/203, Sector-6 CDA
Narkat Nagar
Cuttack- 753014 (Odisha)
Mob.: 7978347075

خان حسنین عاقب

تین پودے

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب استاد اپنے شاگردوں کو جماعت کے کمرے میں سکھانے کے ساتھ ساتھ بازاروں، جنگلوں اور کھلی جگہوں پر لے جاکر بھی علم دیتے تھے۔ اس سلسلے میں سکندر اعظم کے استاد ارسطو کی مثال تاریخ کے صفحات پر درخشاں ہے۔

کسی گاؤں میں ایسا ہی ایک اسکول تھا۔ اس اسکول میں یوں تو دوسرے بھی کئی استاد تھے لیکن ایک معلم ایسے تھے جن سے سب بچوں کو محبت تھی۔ وہ تھے بھی ایسے کہ بچوں کو اپنا طالب علم نہیں اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ سب سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کا نام تھا ابو موسیٰ۔

ایک دن ابو موسیٰ بچوں سے بولے، ''بچو! آج کلاس ختم ہونے کے بعد ہم پاس کے جنگل میں گھومنے جائیں گے۔ تم سب تیار رہنا۔''

بچے خوش ہوگئے۔ بچوں کو تو یوں بھی گھومنا پھرنا بہت پسند ہوتا ہے۔

دوپہر میں اسکول ختم ہوتے ہی ابو موسیٰ نے بچوں کو ساتھ لیا اور گاؤں سے لگے جنگل کی طرف چل پڑے۔

جنگل زیادہ گھنا نہیں تھا لیکن ماحول اور آب و ہوا نہایت خوشگوار تھی۔ جنگل میں مور بھی تھے جن کی آوازیں سماں باندھ دیتی تھیں۔

بچے ادھر ادھر گھومنے لگے۔ اچانک استاد نے بچوں کو آواز دی۔

''بچو! ذرا یہاں تو آنا۔''

سارے بچے دوڑ کر استاد کے اردگرد جمع ہوگئے۔

استاد ایک نازک سے پودے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک بچے سے بولے ''بیٹا ارشد، ذرا تم یہ ننھا سا پودا توڑو۔''

ارشد فوراً نیچے جھکا اور پودے کو زمین سے اکھاڑ لیا۔

استاد نے پودا اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا ”شاباش! چلو اب دوسری جگہ چلتے ہیں۔“

بچے دھیرے دھیرے گھومتے گھامتے آگے بڑھتے رہے۔

استاد نے ایک مرتبہ پھر بچوں سے کہا ”اچھا، ذرا یہاں رک جاؤ۔“

پھر وہ ایک پودے کی طرف اشارہ کر کے بولے ”قاسم، اب کی دفعہ تم یہ پودا اکھاڑو۔“

یہ پودا پہلے والے پودے سے ذرا بڑا تھا۔ قاسم نے اس پر غور نہیں کیا اور فوراً جھک کر پودا توڑنے لگا۔

لیکن یہ کیا؟ ارشد نے جتنی آسانی سے پودا اکھاڑ لیا تھا، قاسم کو اس سے کہیں زیادہ محنت کرنی پڑی۔ اس نے اپنی ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے پودے کی جڑوں کو ڈھیلا کیا، آس پاس کی مٹی ہٹائی تب جا کر وہ اسے نکال پایا۔ اس نے پودا نکال کر استاد کے حوالے کر دیا۔ سارے بچے اسے تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ استاد نے قاسم کو شاباشی دی اور بچوں سے کہا ”بچو! اب تم ذرا پانی پی کر تازہ دم ہو جاؤ، پھر آگے بڑھیں گے۔“

سارے بچے حیران تھے کہ استاد ایسے پودوں کو کیوں اکھاڑ رہے ہیں لیکن وہ چپ تھے۔ انھیں اندازہ تھا کہ آخر میں استاد کچھ نہ کچھ ضرور کہیں گے۔

سب نے پانی پیا اور وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پانچ منٹ بعد استاد نے انہیں دوبارہ چلنے کا حکم دیا۔ سارے بچے اٹھ کر استاد کے پیچھے پیچھے چل دیے۔

تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ استاد نے پھر سب کو روکا اور ایک بچے سے بولے ”بیٹا! اب ایک آخری کوشش۔ طاہر، تم ذرا اس پودے کو زمین سے اکھاڑو۔“ جس پودے کی طرف استاد نے اشارہ کیا تھا یہ پودا کافی بڑا تھا۔ اس کی جڑیں زمین میں کافی گہری تھیں۔ اس کا تنا بھی قدرے مضبوط تھا۔ طاہر نے بہت کوشش کی لیکن یہ پودا زمین سے باہر نکلنے کو تیار ہی نہیں ہوا۔ اس کے چند پتے تو ضرور ٹوٹے لیکن پودا اپنی جگہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

طاہر پسینہ پسینہ ہو گیا۔ استاد نے اسے روکا اور کہا ”بیٹا طاہر، بس کرو۔ یہ پودا تم سے نہیں نکلے گا۔ سب بچے کہیں صاف جگہ دیکھ کر بیٹھ جاؤ، پھر تمھیں ایک بات سمجھاتا ہوں۔“

سارے بچے ادھر ادھر صاف جگہ دیکھ کر گھاس پر بیٹھ گئے۔ استاد نے اپنے کندھے پر لٹکے بیگ سے چاکلیٹ نکالے اور بچوں میں تقسیم کر دیے۔ اپنی پسندیدہ چیز پا کر بچے خوش

ہو گئے۔ پھر استاد بولے ''بچو! مجھے معلوم ہے تم حیران ہو کہ میں نے تم سے پودے کیوں اکھڑوائے۔ دیکھو، میں نے جو پہلا پودا نکلوایا وہ کتنی آسانی سے اکھڑ گیا، بھلا ایسا کیوں؟''

بچے بولے ''اس لیے کہ وہ چھوٹا تھا'' استاد بولے ''ہاں، تم نے صحیح کہا، بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت کمزور تھا اس لیے فوراً ٹوٹ گیا۔ پھر دوسرا پودا بھی اکھڑ گیا لیکن تم نے دیکھا کہ وہ پہلے پودے سے ذرا بڑا اور مضبوط تھا اس لیے اسے نکالنے میں قاسم کو بہت محنت کرنی پڑی۔ اور اب جو تیسرا پودا تھا، وہ طاہر کی محنت کے باوجود اکھڑ نہیں پایا۔ بھلا ایسا کیوں؟''

بچے بولے ''جناب، اس لیے کہ یہ پودا بہت بڑا تھا۔''

استاد بولے ''ہاں، پودا بڑا بھی تھا اور مضبوط بھی۔ اس پودے نے اپنی جڑوں پر بہت محنت کی تھی اس لیے وہ زمین کے اندر گہرائی تک چلی گئی تھیں۔ اس کا تنا بھی خوب مضبوط تھا۔ اسی لیے طاہر کی اتنی ساری مشقت کے باوجود اس کے چند پتے تو جھڑ گئے لیکن وہ پودا اپنی جگہ سے اکھاڑا نہیں جا سکا۔''

بچے بڑے شوق سے استاد کی بات سن رہے تھے۔ اچانک زاہد بول پڑا ''لیکن جناب، آپ نے یہ پودے توڑے کیوں؟''

استاد مسکرا کر بولے ''بیٹے، پودے میں نے کہاں توڑے ہیں؟ وہ تو تم بچوں نے ہی توڑے ہیں۔''

سب بچے ہنسنے لگے۔ پھر ابو موسیٰ بولے ''بچو! تم خود اس پر غور کرو کہ جو پودا جتنا کمزور تھا وہ اتنی ہی جلدی ٹوٹ گیا یا اکھڑ گیا۔ اور جو مضبوط تھا وہ قائم رہا۔

ہماری زندگی بھی اسی طرح ہے۔ اگر انسان اپنی جگہ، اپنے مقام پر اپنی شخصیت کو مضبوط بنائے اور اپنی جڑوں کے ساتھ زمین میں گہرائی تک اترتا چلا جائے تو اسے اکھاڑ پانا ناممکن ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو ہر طرح مضبوط بنانا چاہیے جیسے درخت اپنی جڑوں اور تنے کے ساتھ مضبوط ہوتا ہے اسی طرح انسان کو بھی اپنے اخلاق، کردار، محنت، اور تعلیم جیسے شعبوں میں مضبوط بننا چاہیے تاکہ کوئی مخالف قوت اسے اکھاڑ کر نہ پھینک سکے۔ کچھ سمجھے؟''

بچے بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ ایک ساتھ بولے ''ہاں جناب، بالکل سمجھ گئے۔ اور ہم کوشش کریں گے کہ اپنے آپ کو کمزور نہیں بلکہ مضبوط بنائیں۔''

استاد خوش ہو کر بولے ''شاباش! لیکن ایک بات یاد رکھو، ہمیں پودے اکھاڑنا نہیں چاہیے بلکہ پودے لگانے چاہئیں۔ تمھیں یاد ہوگا کہ ہم نے پچھلے مہینے ہی اپنے اسکول میں شجر کاری مہم کا انعقاد کیا تھا۔ یہ پودے تو میں نے تمھیں سمجھانے کے لیے نکلوائے تھے۔ اب کوشش کرو کہ ان پودوں کو اپنی جگہ واپس لگا سکو۔''

لڑکوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ دونوں پودوں کو جڑوں کے ساتھ دوبارہ ان جگہوں پر لگا دیا جہاں سے انھیں نکالا گیا تھا۔ ان کے اردگرد ڈھیر ساری مٹی بھی لگا دی تاکہ وہ پانی سے بہہ نہ جائیں۔ پھر ابو موسیٰ بچوں سے بولے ''تو بچو، کیا خیال ہے؟ اب واپس چلیں؟ تمھیں اسکول سے اپنی سائیکلیں لے کر گھر بھی تو جانا ہے۔''

سارے بچے ابو موسیٰ کے ساتھ خوشی خوشی اسکول کی طرف واپس چل پڑے۔

(تعارف اگست 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Khan Hasnain Aaquib
(Qadam Hasnain Khan)
Allama Iqbal Teachers Colony
Mominpura, Washim Road
Pusad - 445204 (Maharashtra)

فاضلہ الفت

کہانی

صبح کی بارش

پانی کی چند بوندیں میرے رخسار پر پڑیں۔ آنکھیں کھلنے میں دقت محسوس نہ ہوئی۔ نگاہیں سیدھی کھڑکی کی طرف گئیں جہاں سے بارش کی بوندوں نے اماں کی طرح جگانے کا کام کیا تھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے، جب میں نے بارش میں رفتار محسوس کی۔ افففف — کیا منظر، نہ پوچھیے۔ دور پہاڑ، پیڑوں کی قطار، بارش میں رفتار اور میں بیدار۔ جیسے ہر شے میری منتظر تھی۔

میں کب تلک کھڑکی کے پاس بارش کو تکتی رہی، یاد نہیں۔ اچانک کسی نے شانے پر ہاتھ رکھا، ایک پل کو تو میں ساکت رہی، پھر مڑ کے دیکھا تو اماں ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کھڑی تھیں۔ جیسے میرے بیدار ہونے کی خبر کوئی انھیں دے گیا تھا۔

صبح کی پہلی بارش، جسے ایک پل آنکھوں سے اوجھل کرنا گوارا نہیں۔ ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کب بالکنی کی اور رخ کیا، پتا ہی نہیں چلا۔ بادِ صبا کے لمس نے سانسوں سے جسم اور جسم سے روح تک کا سفر کیا۔ بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ افففف — خوبصورت صبح کو نظر انداز کر کے تو تھ برش کا تکلف اب کون اٹھائے؟ یہ خوبصورت پرندے بھی تو برش نہیں کرتے؟ پھر یہ اشرف المخلوقات خواہ مخواہ کا تکلف کیوں کرے؟ یہ ضروری کیوں؟ آخر گرم چائے بھی تو سب چیزوں کو اچھی طرح صاف کر دیتی ہے۔

یہ پرندے جو اس وقت کھانے کی تلاش میں نکلا کرتے تھے، آج اپنے بچوں کے ساتھ گھونسلے میں بارش کے مزے لیتے دکھائی پڑتے ہیں۔ دل کی بس اتنی سی خواہش ہے کہ یہ پل تھم جائے۔ اسکول جانے کی فکر اور نہ ہوم ورک کا ڈر۔ مگر جناب! ایسا ہونے سے رہا۔

ابھی چائے کی چسکیاں ختم ہی ہوئی تھیں کہ وقت نے بھی کوئی مہلت نہ دی۔ اور کب 6 بجنے کو ہو گئے، پتا ہی نہیں چلا۔ اماں اچانک میری طرف تیز قدموں سے آئیں، خوف کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ رفتار تیز تھی۔ ’’آج بارش کی وجہ سے اسکول کی چھٹی ہے۔‘‘ انھوں نے خوش دلی سے کہا۔ میں بھی

بہت خوش ہوئی۔ خوشی کا ٹھکانہ ہی نہ تھا کہ اماں نے مجھے کام دے دیا۔ میں اس سے فارغ ہوئی اور پھر سے بارش کو دیکھنے لگی، اس کی رفتار میں ذرا سی کمی ضرور آئی تھی، مگر بارش کی بوندیں مسلسل برس رہی تھیں۔ بالکل زندگی کی چال سی، جو تیز اور دھیمی ہوتی ہے مگر چلتی رہتی ہے۔

پاس نیم کا پیڑ بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا جس کے پورے وجود کو بارش کی بوندوں نے تر و تازہ کر دیا تھا۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اور گھونسلے میں پرندے بھی بہت اچھے لگ رہے تھے۔

ابھی میں بالکنی ہی میں کھڑی تھی کہ اچانک مجھے اپنے ہاتھ پہ گدگدی محسوس ہوئی۔ میں نے دائیں جانب نظر ڈالی تو ایک چھوٹی سی، پیاری سی، شرارتی سی گلہری پر نگاہ پڑی، جو ابھی بچی معلوم ہوتی تھی، وہ اپنی پونچھ سے میرے ہاتھوں پر گدگدی کیے جاتی تھی۔ میں نے اسے ہتھیلی پر اٹھالیا۔ اس کی بڑی سی کالی آنکھوں میں میرا عکس صاف دکھائی پڑتا تھا۔ ہلکی گلابی ناک، لمبی مونچھیں، چھوٹے دو کان اور روئی سا جسم پر کشش معلوم پڑتا تھا۔ یوں کب میں بارش کو نظر انداز کر کے گلہری کی طرف متوجہ ہوئی، احساس ہی نہیں ہوا۔

بارش اب تھم گئی تھی۔ دن چڑھنے کو تھا۔ سورج چھٹی پر اور میں اب تک بالکنی میں گلہری کے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔ جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ میں نے سوچا کہ میرا اسے یوں گلہری کہنا برا لگتا ہوگا، جیسے مجھے کوئی 'لڑکی' کہہ کر مخاطب کرے تو مجھے لگتا ہے۔ میں نے دیر تک نام سوچا۔ کلو، چنو یہ سب پرانے اور بے مزہ لگے، نئے دور میں ایسے ناموں کا انتخاب بینام گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ میں نے دیر تک غور وفکر کرنے کے بعد ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی اور Fiona نام کا انتخاب کیا۔ ہاں، اس لیے کہ یہ بہتر ہی نہیں بلکہ بہترین بھی تھا۔ Fiona کے معنی سفید، صاف، پیلا، سنہرے بالوں والی اور وہ تو انھیں صفات سے پر تھی۔

مجھے اچانک محسوس ہوا کہ بارش تھم چکی ہے، دن چڑھنے کو ہے اور سورج بھی اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے اتاولا ہوا جا رہا ہے۔ میں Fiona کو بالکنی سے اندر لے آئی۔ اماں ابھی تک کچن میں مصروف تھیں۔ فیملی میں تو بس تین ہی لوگ ہیں، نہ جانے وہاں انھیں کتنے کام نپٹانے ہوتے ہیں۔

اب مجھے Fiona کی رہائش کی فکر ستا رہی تھی۔ میں برآمدے میں آگئی جہاں سے دور آسمان، نیم کا پیڑ، چھوٹا سا باغیچہ اور باہر کا دروازہ دکھائی پڑتا ہے۔ میں جھولے پر بیٹھی، Fiona کو گود میں لیے کیاری میں لگے پھولوں کو تکتی رہی۔ ان کی خوشبو میرے پورے وجود کو معطر کر رہی تھی۔ اب میں نے Fiona کی رہائش کے لیے اچھی جگہ تلاش کر لی تھی۔ جھولے کے سامنے پاس کے ستون کے قریب ہی میں اس کے گھر کی تعمیر میں مصروف ہوگئی۔ ایکس پوزیشن میں رکھی دو کمر تک آتی ہوئیں لکڑیوں پہ Fiona کا گھر ٹکا ہوا تھا، جسے میں نے سرخ، سفید اور اسلیٹی رنگ دیے تھے۔ گھر کے باہر میں نے پھولوں کے لیے لان چھوڑی تھی۔ وہاں گملے تو نہیں مگر 'صبح بخیر' کے پھول رکھے جا سکتے تھے۔ گھر کے اندرونی حصے میں کچھ روئی کے ٹکڑے بچھا دیے اور ایک پیالی اس کے لنچ کے نام بھی کر دی جو اخروٹ اور کاجوؤں سے بھری تھی۔ آج کی شام چائے، امراؤ جان اور Fiona کے نام تھی۔ تینوں اتنے پر کشش کہ ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یوں دن گزرتے ہوئے محسوس ہی نہیں ہوا کہ Fiona کے ساتھ ایک ہفتہ ہونے کو ہے۔ روز و شب اس کے نام کرنا، ہر شے کو اس کے لیے نظر انداز کرنا، اور سارا دن بس اُسی سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔

اسے سن فلاور کے بیج اور کاجو بہت پسند تھے۔ اسکول چھوٹتے ہی میں سارا دن اسی کے ساتھ رہتی۔ اب وہ کچھ بڑی ہوگئی تھی اور کچھ شرارتی بھی۔ اسے گھر سے نکالنے میں دقت نہ ہوتی، اکثر وہ خود باہر آجایا کرتی تھی۔ صبح بیدار ہوتے ہی میں اس کے پیارے سے گھر پر نئے پھولوں سے 'صبح بخیر' کرتی، کبھی سن فلاورز، کبھی روز اور کبھی چائنہ روز بھی دیا کرتی تھی اور وہ انھیں ننھے ہاتھوں سے اٹھاتی اور بڑی آنکھیں مجھے دکھاتی، بالکل قاتلانہ آنکھیں جو مجھے شکریہ کہتی محسوس ہوتی تھیں۔ لنچ ہم ساتھ ہی کرتے تھے وہ لنچ میں کاجو پسند کرتی تھی۔ یوں 'دو چھوٹے اور پیارے ہاتھوں سے انہیں اٹھانا اور کترنا' یہ ادا دل میں اترنے والی ہی تو ہے۔

دھیرے دھیرے اس کی شوخی بڑھتی جارہی تھی۔ بعض اوقات میرے اسکول سے واپسی پر وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں چھپ جاتی اور پھر اچانک باہر آ کے ہلکا سا مسکراتی جیسے مجھے چڑھا رہی ہو۔ شام دیر تک ہم پھولوں کے پاس ہوتے، کبھی میں بھی وہیں لیٹ جاتی، اور وہ مجھے گدگداتے ہوئے میرے سر سے پاؤں تک کا سفر کرتی رہتی۔

آج شام جب ہم باغیچے میں ساتھ تھے، میں نے اس کی آنکھوں کو پڑھنا چاہا۔ میرا عکس ان میں آج کچھ دھندلا سا لگا۔ جیسے پانی میں میری پرچھائی ہو۔ مجھے Fiona کی طبیعت بگڑتی محسوس ہوئی۔ آج اس نے سن فلاور کے بیج بھی نہیں کھائے اور نہ ہی اپنی پونچھوں سے مجھے گدگدی کی تھی۔

رات دیر تک ہم برآمدے میں ستون سے لگے بیٹھے رہے۔ جیسے وہ میری گود سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے پھر اس کی بڑی، خوبصورت، سیاہ آنکھوں کو پڑھنا چاہا مگر ستاروں سے روشن سیاہ آسمان اور میرا دھندلا، ہلکا سا عکس کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔

رات کب میں سونے چلی آئی، مجھے خبر نہیں۔

جب اچانک میری آنکھ کھلی تو میں سیدھے برآمدے کی طرف دوڑی گئی۔ Fiona اب بھی ستون سے لگی کھلے آسمان کو تک رہی تھی۔ جیسے وہ بے زبان مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا اور گھر کے اندر چلی گئی۔ اس کی بڑی آنکھیں اب بھی مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ دوبارہ کب آنکھ لگ گئی کچھ پتا ہی نہیں چلا۔

گھنے جنگل کا تنگ راستہ، نہ آدم نہ آدم زاد، چاروں طرف خوف ناک سناٹا اور بڑے بڑے درخت کی شاخوں پر جھولتے عجیب و غریب پرندے، Fiona دوڑے جا رہی ہے اور میں اس کے پیچھے پیچھے. اچانک وہ پلٹی اور کچھ روشن ہوا، روشنی کے بعد سب کچھ ختم Fiona____!

میں چیخ کر اٹھی۔ مجھے محسوس ہوا میں رو رہی ہوں، لیکن یہ کیا... یہ تو بارش کی ویسی ہی بوندیں تھیں جن کے لمس نے مجھے پچھلے ہفتے بیدار کیا تھا۔ آج بھی بارش میں وہی انسیت اور خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ آج پھر سے ایک نئی صبح روشن تھی، میرے بیدار ہونے کی وجہ آج پھر سے بارش کی بوندیں تھیں، جو میرے اس برے خواب کو میرے ذہن سے مٹانا چاہتی تھیں۔

میں برآمدے کی طرف دوڑی۔ Fiona! میں نے آواز دی مگر کوئی باہر نہ آیا۔ اندر جھانک کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کرنا مناسب سمجھا، کبھی کبھی وہ میرے ساتھ چھپن چھپائی کھیلا کرتی۔ جب وہ باہر نہیں آئی، تو میں نے جھولے پر نظر ڈالی، جھولا بھی خالی تھا۔ میں باغیچے کی طرف گئی، وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ میں تیز قدموں سے بھاگتی بالکنی کی طرف آئی۔ بالکنی کی دیوار پر سن فلاور پڑا ہوا تھا، جسے کل میں نے Fiona کو دیا تھا۔ اس کی پنکھڑیاں علیحدہ میرے دائیں

جانب جاتی دور تک بکھری دکھائی دیں۔ میں نے ان کا تعاقب کیا جو دیوار کے آخری حصے تک پہنچ کے ختم ہو رہی تھیں۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی، پھر ذرا جھک کر میں نے باہر دیکھا تو نیم کی ایک شاخ پر Fiona دکھائی دی۔ میں نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

اس کے ساتھ دو اور گلہریاں تھیں۔ جو عمر میں Fiona سے کافی بڑی لگ رہی تھیں۔ Fiona نے میری طرف پیار سے دیکھا اور وہ تینوں جانے کو تیار ہوگئیں۔ جاتے جاتے Fiona دوبارہ پلٹی، جیسے مجھے الوداع کہنا بھول گئی ہو۔ پھر وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔

میں نے سن فلاور کی بکھری ہوئی پنکھڑیوں کو اکٹھا کیا، جس میں Fiona کے لمس موجود تھے۔

اب میں جھولے پر اکیلی بیٹھی بہت دیر تلک بارش اور Fiona کے گھر کو دیکھتی رہی۔ میں نے ڈائری کھولی اور اس جگہ کچھ لکھنا شروع کیا جہاں میری اور Fiona کی پچھلے ہفتے کی فوٹوز تھیں۔

''رشتہ محبت کا نام ہے اور محبت احساس کا۔'' احساس کبھی الفاظ میں بیان نہیں ہوتا۔ جیسے آج نہیں ہوا۔

کبھی برس گئی تو بہارسی، کبھی گم صم سی ہیں۔

یہ بارشیں بھی تم تم سی ہیں۔

نم آنکھوں سے میں نے بکھرے ہوئے سن فلاور کو ڈائری میں رکھا اور دوبارہ بارش کی طرف بھاگی جو شاید کب سے میری منتظر تھی۔ وہ مسلسل ہوتی رہی، گویا میرے ساتھ Fiona کی جدائی میں روتی رہی۔

■

Fazila Ulfat
Domanpura, Teeliyana
Maunath Bhanjan - 275101 (UP)
Mob.: 9889123129

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'بچوں کی دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............... بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

Email.: magazines@ncpul.in, 011-26108159: فیکس 011-26109746: فون

دستخط

روبینہ ساگر

چڑیا رانی اور بلی

ایک بے حد خوبصورت ہرا بھرا جنگل تھا جہاں ہر قسم کے پیڑ پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ درختوں پیڑوں کی شاخوں پر پرندوں کے آشیانے تھے۔ پنچھیوں کی مدھر چہچہاہٹ سے جنگل ہمہ وقت گونجتا رہتا تھا۔ آم کے درخت پر کوئل بیٹھی مدھر گیت سے سب کا دل موہ لیتی تھی۔ اس جنگل کے سبھی پرندے اور جانور ہنسی خوشی ساتھ رہتے تھے۔ جامن کے پیڑ کے بازو ہی میں نیم کا ایک بڑا سا درخت تھا، جس پر چڑیا رانی اپنے بچوں کے ساتھ رہتی تھی، وہ صبح ہوتے ہی خدا کی حمد وثنا گاتی ہوئی رزق کی تلاش میں نکل جاتی تھی، اور جیسے ہی سورج غروب ہونے لگتا ہے تو وہ بھی اپنے آشیانے کی طرف لوٹ آتی تھی۔ اس کا گھونسلا بہت خوبصورت اور نرم تنکوں سے بنا ہوا تھا، جسے چڑیا رانی نے روئی بچھا کے اور بھی نرم بنا دیا تھا۔ وہ دین رات اپنے بچوں کی خدمت میں لگی ہوئی تھی اور اپنے ننھے منے پیارے بچوں کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔

ڈال پر لگے ہوئے پھول پتے اپنی بہار دکھا رہے تھے، چمن میں مسکراتی کلیوں نے آنکھ کھولی تھی، چڑیا رانی دن بھر اپنے بچوں کے لیے دانہ چن کر لاتی تھی اور انھیں کھلاتی تھی، جس نیم کے درخت پر چڑیا رانی کا بسیرا تھا اسی درخت کی کھوہ میں ایک چالاک بلی بھی رہتی تھی۔ وہ کب سے موقعے کی تلاش میں تھی کہ کب چڑیا باہر جائے اور وہ اس کے بچوں کو کھا جائے وہ دن بھر درخت کے ارد گرد چکر کاٹتی رہتی تھی۔ اس نے کئی بار درخت پر چڑھ کر چڑیا کے بچوں کو کھانا چاہا تھا لیکن وہ جب بھی گھونسلے تک پہنچتی، آس پاس کے درختوں پر بیٹھے پرندے شور مچا دیتے تھے، اور پھر ان کی آوازیں سن کر وہ گھبرا کر نیچے اتر کر بھاگ جاتی تھی۔

بے چاری چڑیا اس چالاک بلّی کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگی تھی، اور اس نے اپنے بچوں کو سختی سے باہر نکلنے کو منع کیا تھا، کیونکہ بلّی ہر وقت ان کے باہر آنے کا انتظار کرتی تھی، چڑیا نے اپنے بچوں سے کہہ دیا تھا کہ میں دن بھر تمھارے لیے دانہ لانے جاتی ہوں، اگر میری غیر موجودگی میں یہاں کوئی بھی آئے تو تم ہرگز دروازہ نہ کھولنا، اور بچے اس کی بات مان لیتے تھے۔ اس بلی نے جنگل کے سبھی جانوروں کو پریشان کر رکھا تھا ایک صبح کی بات ہے ٹینوں خرگوش اپنے بچوں کے ساتھ باغ کی سیر کو جا رہا تھا چالاک بلی ایک درخت کے پیچھے چھپی اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی اس نے ٹینوں کے بچوں کو اپنا نشانہ بنانا چاہا جیسے ہی ٹینوں خروش مولی کے کھیت کے طرف بڑھا اس کا ایک بچہ پیچھے رہ گیا تھا موقع اچھا تھا تبھی بلی نے لپک کر اس کے بچّے کو منہ میں دبوچ لیا تھا اور وہاں سے بھاگتی ہوئی چلی جا رہی تھی اپنے بچے کی آواز پر ٹینوں خرگوش نے پلٹ کر دیکھا تھا اور زور زور سے روتا ہوا اسے پکار رہا تھا لیکن وہ سنی ان سنی کرتی ہوئی اس کے بچے کو منہ میں دبوچے دوڑتی چلی گئی ٹینوں خروش کے رونے کی آواز سن کر ٹیں ٹیں طوطا اور چڑیا رانی اڑتے ہوئے اس کے پاس آئے تھے اور وہ سب بلی کی تلاش میں نکل چکے تھے اور چالاک بلی گھنے درختوں کے پیچھے چھپی بیٹھی خرگوش کے بچے کو چٹ کر گئی تھی اور اب دل ہی دل میں چڑیا رانی کے بچوں کو کھانے کا منصوبہ بنا رہی تھی وہ ہر روز کسی نہ کسی جانور کے بچے کو لقمہ اجل بناتی تھی اس کی وجہ سے پرندے اور جانور میں ایک خوف پیدا

ہو گیا تھا بلی کو کیسے جال میں پھنسایا جائے ہر روز سب منصوبہ بناتے لیکن چالاک بلی ان کے جال میں پھنستی ہی نہیں تھی اس کا شکار روز جاری تھا۔

ایک صبح کی بات ہے۔ موسم بے حد حسین و دل فریب ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش کی پھوار برس رہی تھی، درختوں پر بارش کے پانی کی بوندیں موتی کی طرح چمک رہی تھیں، آج جنگل کے سبھی پرندے جھیل کے کنارے کھڑے موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جھیل کے اوپر سفید بگلوں کے جھنڈ اڑ رہے تھے۔ ٹیں ٹیں کرتا مٹھو تو کھلے آسمان میں قلابازیاں کھا رہا تھا۔ اتنے حسین موسم کو دیکھ کر چڑیا کے بچوں کا دل بھی باہر آ کر اڑنے کو چاہا تھا، اب ان کے پر نکل آئے تھے اور وہ تھوڑا تھوڑا اڑنا بھی سیکھ گئے تھے، لیکن نیچے چالاک بلی ہمیشہ تاک لگائے بیٹھی رہتی تھی کہ کب چڑیا کے بچے باہر آتے اور وہ انھیں چٹ کر جاتی آج بھی وہ راستہ صاف دیکھ کر تاک میں بیٹھی تھی۔

ٹینوں خرگوش، میں میں بکری اور ٹیں ٹیں طوطا اس کی حرکتوں کو کب سے دیکھ رہے تھے وہ سب ایک جھاڑ کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ انھوں نے آج اسے سبق سکھانے کا سوچ ہی لیا تھا۔ سب نے مل کر وہاں درخت کے نیچے کانٹے بچھا دیے تھے بلی دوسری طرف سے درخت کے اوپر چڑھ گئی تھی اس لیے نیچے بچھے کانٹے دیکھ نہیں پائی تھی اور ٹیں ٹیں طوطے نے گھونسلے کے قریب بھی ایک کانٹے دار ٹہنی رکھ دی تھی۔ بلی نے جیسے ہی گھونسلے پر جھپٹا مارا تو تیز نوکیلے کانٹے اس کے پنجوں میں کھب گئے تھے وہ درد سے کراہتی ہوئی۔ دھم سے نیچے آ گری تھی۔ نیچے پڑے کانٹے اس کے پیروں کو زخمی کر گئے تھے اس کے پیروں سے خون نکل رہا تھا درد کی شدت سے اسے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ کراہتی ہوئی وہیں بیٹھی رو رہی تھی اسے اس حال میں دیکھ کر جنگل کے سبھی جانور ہنس رہے تھے اور اسے تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس کی بدمزاجی کی وجہ سے جنگل کا کوئی بھی جانور اور پرندے اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ جب شام کے سائے بڑھنے لگے تو چڑیا رانی بھی اپنی منزل مقصود کی طرف واپس آ رہی تھی۔ بلی پر نظر پڑتے ہی اس نے اس کے قریب جا کر پوچھا تھا۔ ''بلی بہن کیا ہوا ہے آپ رو کیوں رہی ہو'' چڑیا رانی کے پوچھنے پر بلی نے روتے ہوئے اسے ساری بات بتا دی تھی۔ اس سے اپنے کیے کی معافی بھی مانگی تھی وہ بہت شرمندہ تھی ''دیکھو بہن دوسروں کا برا چاہنے والوں کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے، اللہ ہر ایک کی حفاظت کرنے والا ہے، میں بھی روز اللہ کے بھروسے اپنے بچوں کو چھوڑ کر جاتی ہوں اور آج بھی اللہ نے میرے بچوں کی حفاظت کی ہے اور وہ تمھارا لقمہ بنتے بنتے بچ گئے۔'' چڑیا کی بات پر بلی کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو آ گئے تھے چڑیا رانی نے اسے تہہ دل سے معاف کر دیا تھا۔ چڑیا جنگل کے آس پاس کے جانوروں کو بلا کر لائی تھی اور پھر ان سب نے مل کر بلی کی مدد کی تھی اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی تھی۔ بلی سب سے اپنے کیے کی معافی مانگ رہی تھی اور ان سب سے پکا وعدہ کیا تھا کہ وہ اب جنگل کے کسی بھی جانور کو نہیں ستائے گی وہ اپنے گناہوں سے توبہ کر چکی تھی خدا نے اس کو دوسروں کو ستانے کی سزا دے دی تھی اور سب نے اُسے تہے دل سے معاف کر دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد بلی کی دوستی جنگل کے ہر ایک جانور سے ہو گئی تھی چڑیا رانی تو اس کی پکی سہیلی بن چکی تھی اور وہ سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہنسی خوشی رہنے لگے تھے اور خوب صورت جنگل پرندوں اور جانوروں کی آوازوں سے ہر وقت گونجتا رہتا تھا۔

■

Rubina Sagar Rubi Shaikh Bilal Sagar
Hirapura, Near Masjid Darussalam
Achalpur City
Amravati- 444806 (Maharashtra)

بال سبھا

سید اسد تابش

کردار:

(1) امی جان (2) بڑی بیٹی: عفت (3) دوسری بیٹی زیبا (4) رضی: بیٹا (5) زوبیا: کالونی کی لڑکی، سہیلی
(6) بشیرا: سہیلی (7) طوبہ: ایک سہیلی (8) فواد: رضی کا دوست (9) صادق: گھر کا ملازم

پہلا منظر

(گھر میں بچے بیٹھے ہیں۔ کھیل کود اور دھینگا مشتی میں مگن ہیں)

عفت: (زیبا سے) میں تمھاری شکایت امی سے کردوں گی...

زیبا: اور جو تم اتنی دیر سے کچن سے مٹھائی چوری کر کے کھا رہی ہو، میں کیوں چپ رہوں گی...؟

عفت: ہاں ہاں! بول دو، تمھارا مال تھوڑی ہی ہے۔

زیبا: (رضی سے) رضی...! تم امی جان کو بلا لاؤ۔

(رضی موبائل پر ٹک ٹاک ویڈیوز دیکھ رہا ہے۔ دونوں بہنوں کو جھگڑتے دیکھ شور کرنے لگتا ہے)

رضی: امی امی...! جلدی آؤ... پھر سے۔

(امی جان کچن سے کام چھوڑ کر آتی ہیں)

امی جان: کیا لگا رکھا ہے... گھر کو مچھلی بازار بنا رکھا ہے۔

زیبا: مچھلی بازار میں بچے جھگڑتے ہیں کیا...؟

امی جان: ہاں... ہاں...! تجھے تو اس طرح کے سوال بہت آتے ہیں۔

زیبا: امی جان عفت باجی نے کچن سے لڈو چرا کر کھائے ہیں...

امی جان: (سمجھاتے ہوئے) نہیں...، عفت بیٹی... چوری کر کے کھانے سے دانت گر جاتے ہیں۔

زیبا: تو کیا دادا جان بھی گھر میں چوری چھپے لڈو کھاتے ہیں... دیکھا ان کے سارے دانت گر گئے ہیں۔ تبھی گھر کا ملازم، صادق داخل ہوتا ہے۔

صادق: (مالکن سے) مالکن ایک خوش خبری ہے۔ ڈاکٹر قیصر نے ایک دوائی کا نسخہ تیار کیا ہے۔

امی جان: ارے بھئی... کیسا نسخہ...؟
صادق: جی مالکن... وہ نسخہ بچوں کے لیے ہے... شرارتی بچوں کے لیے... جو بچے گھر میں دھینگا مشتی کرتے ہیں ان کو اگر دوائی دی جائے تو وہ سمجھدار اور سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔
امی جان: ارے واہ، بھئی یہ تو کمال ہو گیا۔ اچھا؟ صادق بچوں کی ضد، بے جا شرارتیں اور رونا سب بند ہوتا ہے اس دوائی سے...؟
صادق: بھلا یہ کیا بات ہوئی مالکن... پھر آپ کہیں گی شرارتیں بند کرنے کی دوائی، جلن حسن، مکر وفریب بند کرنے کی دوائی...، چوری، ڈکیتی اور فساد بند کرنے کی دوائی... یہ دوائی نہ ہوئی پولیس کا ڈنڈا ہو گیا... (منہ پھلا کر دوسری طرف دیکھنے لگتا ہے)
زیبا: آج کل پولس کا ڈنڈا بھی ہر جگہ کام نہیں کرتا۔ اسے بھی بند کرنے کی دوائی بہت پہلے سے کالا بازاری کرنے والوں نے ایجاد کر لی ہے۔
صادق: میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہی ہیں یہ باتیں (امی جان سے) آپ کہیں تو دوائی لا دیتا ہوں... قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ پچاس روپے کی بوتل ہے۔ کم از کم ایک مہینہ چلے گی۔
امی جان: ٹھیک ہے، یہ لے پچاس روپے اور ذرا لے آ... وہ دوائی! صادق باہر جاتا ہے اور جلد ہی دوائی لے کر لوٹتا ہے۔
صادق: لیجیے مالکن زیبا بٹیا کو پلا دیتے ہیں۔
زیبا: (نقل اتارتے ہوئے) زیبا بٹیا کو پلاتے ہیں... یہ دوائی سب سے پہلے دادی جان کو پلائی جائے، گھر میں سب سے زیادہ شور تو ان کا ہی ہوتا ہے۔
(دادی کی نقل اتارتے ہوئے) بچو! نماز پڑھ لو، بچو! ٹی وی بند کرو، بچو! یہ کرو، بچو! وہ کرو۔ ارے آخر ہماری بھی کوئی زندگی ہے۔
(اپنے بہن اور بھائی سے مخاطب ہوتی ہے) دیکھو، عفت باجی اور رضی اس گھر میں ہماری آزادی چھینی جا رہی ہے۔ ہماری حق تلفی ہو رہی ہے۔ اب ہمیں آپس کے جھگڑے ختم کر کے متحد ہونے کا وقت آ گیا ہے۔
رضی: کیوں...؟ ایمرجنسی لگ گئی ہے کیا...؟ سبھی دشمن دوست بن رہے ہیں۔
عفت: (سنجیدگی سے) نہیں رضی، اب ہمیں آپسی نا اتفاقیاں بھولنی ہوں گی۔
یہ بڑے ہمارے خلاف ایک ہیں۔ پھر ہم بچے کیوں اپنے آپسی اختلافات میں پڑے رہیں۔ ہم آج ہی کالونی کے سب بچوں کو اکٹھا کریں گے اور ایک تنظیم بنائیں گے۔
اس تنظیم کا نام ہوگا 'بال سبھا' ہم اس تنظیم کے تحت بچوں پر ہو رہے مظالم اور ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کریں گے۔
زیبا: آج سے ہمارا ہیرو ہے عامر خان... وہی ایک اسٹار ہے جو بچوں کے لیے فلمیں بناتا ہے۔
(پس منظر میں فلم تارے زمیں پر کا گیت تو دھوپ ہے چھن سے بکھر، تو ہے ندی وہ بے خبر بجتا ہے)

دوسرا منظر

(کالونی کے بچے، عفت کے یہاں جمع ہیں،
رضی سب کو پانی دے رہا ہے)

زیبا: دوستو...! آج ہم نے کالونی کے سبھی بچوں کی میٹنگ اس لیے بلائی ہے تاکہ ہم متحد ہو کر ہم پر ہو رہے مظالم کے خلاف لڑ سکیں۔ ہم اس تنظیم کے تحت اپنے حقوق کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہی ہے آج کل سبھی

اپنے حقوق مانگنے سڑکوں پر اتر رہے ہیں۔ بڑوں کی طرف سے ہونے والے مظالم کا خاتمہ اور ہماری آزادی ہی اس تنظیم کا مقصد ہے۔

(سارے بچے تالیاں، بجاتے ہیں)

زیبا: میں آج کی میٹنگ میں 'بال سبھا' کے ذمے داران کے کچھ نام پیش کرنا چاہتی ہوں۔ رضی سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ ان عہدوں کا اعلان کرے۔

رضی: بھائیو اور بہنو! بال سبھا کے مقاصد زیبا باجی نے بیان کردیے۔

اب میں مجلس کی انتظامیہ کے ناموں کا اعلان کررہا ہوں۔ میں اس کمیٹی کی صدارت کے لیے عفت باجی کے نام کا اعلان کرتا ہوں۔

(سبھی بچے تالیاں بجا کر تائید کرتے ہیں)

رضی: اسی طرح نائب صدر ہمارے عامر بھائی ہوں گے۔

(بچوں کی تالیاں)

رضی: بال سبھا کی سکریٹری زیبا باجی ہوگی اور خزانچی رخسار باجی...

(بچوں کی تالیاں)

رضی: اب میں ہماری تنظیم کی صدر، عفت باجی سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آج کی میٹنگ اور بال سبھا کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالیں۔

عفت: (سب کو مخاطب کرتے ہوئے) بھائیو اور بہنو! ہماری بال سبھا نے یہ طے کیا ہے کہ سب سے پہلے، بچوں پر بننے والے لطیفوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

آپ جانتے ہیں...؟ بچوں پر کیسے کیسے لطیفے گڑھ لیے گئے ہیں۔

اسکول اور گھر ہر جگہ بچوں کی تضحیک ہورہی ہے۔ وہ لطیفہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا...؟ دو بچے، اسکول دیر سے پہنچتے ہیں... ٹیچر ان سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھتے ہیں تو ایک بچہ کہتا ہے کہ میرے پانچ روپے گم ہوگئے تھے۔ میں ڈھونڈھ رہا تھا، اس لیے دیر ہوئی۔ ٹیچر دوسرے بچے سے پوچھتے ہیں اور پپو تم کیوں لیٹ ہوئے۔ پپو کہتا ہے... ٹیچر اس کے پانچ روپے پر پیر دے کر کھڑا تھا... (سبھی بچے ہنستے ہیں) ہنسیے مت، یہی تو سوچ بدلنی ہے۔ ایسی بہت سی من گھڑت باتیں ہیں۔ میں نے تو ایک ہی مثال پیش کی۔ اس لیے آیئے بھائیو

اور بہنو ہم آج عزم کریں کہ ہم اپنی 'بال سبھا' کو مستحکم بنائیں گے۔

(سبھی بچے عفت باجی زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں)

دادی جان: ارے رکو رے کم بختو... سارا دن دھینگا مشتی کرتے رہتے ہو۔ یہ کیا کر رہے تھے تم۔ بڑوں بزرگوں کے خلاف کوئی پارٹی بنا رہے تھے۔ ادھر آؤ میں تمھاری پارٹی نکالتی ہوں۔ (سارے بچے بھاگ جاتے ہیں مگر رضی ہاتھ لگ جاتا ہے)

دادی جان: آ میرے بیٹے۔ تو تو ان نکموں جیسا نہیں ہے۔ یہ لے دوائی لے لے۔

رضی: ہمیشہ سننے والوں کو ہی سنایا جاتا ہے، دبنے والوں کو ہی دبایا جاتا ہے اور ماننے والوں کو ہی منایا جاتا ہے۔ برے سے خدا ڈرے۔ دادی جان میں پوچھتا ہوں آخر مجھے ہی کیوں دوائی دی جا رہی ہے۔ (تبھی اسٹیج پر ماں بھی آجاتی ہے)

دادی جان: (اپنی بہو کی طرف دیکھتے ہوئے) مجھے لگتا ہے یہ 'بال سبھا' نے بچوں میں سچ مچ بیداری پیدا کر دی ہے (تنک کر) جنھیں بولنا نہیں آتا تھا وہ بھی اپنے حق کی بات کر رہے ہیں)۔

(رضی ڈرتا ہوا جاتا ہے) بال سبھا کی صدر عفت، عامر اور نازنین کو لیے آتی ہے۔

نازنین: (رضی سے) بتاؤ تم! کون تمھارے ساتھ زبردستی کر رہا تھا (رضی دادی جان کی طرف اشارہ کرتا ہے)۔

نازنین: دیکھیے ہم بچے کبھی آپ بڑوں پر زبردستی کرتے ہیں کیا؟ پھر ہم پر کیوں زبردستی کر رہے ہیں۔ دادی (پینترا بدلتے ہوئے) بیٹی میں زبردستی نہیں کر رہی تھی بلکہ میں تو صرف اپنے پوتے کو دوائی دے رہی تھی۔

نازنین: کیوں! ''ہم بچے کبھی کسی بڑے کو دوا دیتے ہیں کیا؟''

دادی جان: بیٹی! بھلا تمھیں کون روکے گا۔ کبھی دوائی پلا کر تو دیکھو۔

نازنین: نہیں ہمیں پیو اور پلاؤ نعرہ نہیں دینا ہے۔ (عفت سے) دیکھیے عفت باجی آپ ہماری کالونی کے سبھی بچوں کو جلد سے جلد بلاؤ۔ آج ہی میٹنگ لے کر ہمیں کام شروع کرنا ہے۔ ہم پارلیمنٹ تک جائیں گے، ہڑتال کریں گے، رستہ جام کر دیں گے اور گاڑیاں روک دیں گے۔

(بیزار ہو کر دادی جان اور امی چلے جاتے ہیں)

(رضی دوڑتا ہوا جاتا ہے اور بچوں کو بلا لاتا ہے)

عفت: بھائیو اور بہنو! بال سبھا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس 'مون برت' والی دوائی کے لیے ہم کلکٹر آفس کے سامنے دھرنا دیں گے اور ضرورت پڑی تو اس دوائی کے خلاف 'مون برت' بھی رکھیں گے۔

ایک لڑکا: لیکن وہ ہمارا منہ بند کرنا کیوں چاہتے ہیں؟

نازنین: تاکہ وہ آرام وسکون سے کام کر سکیں۔

ایک لڑکا: وہ آرام وسکون سے کام کرنا کیوں چاہتے ہیں؟

ایک لڑکا: پھر تو ہمیں مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ سارے بچے سمجھ جاتے ہیں۔

نازنین: اے باؤلی لا بھلا دوائی ساری کی ساری اس باؤلے کو ہی پلا دیں۔ جب سے بڑبڑ کیے جا رہا ہے۔

(تعارف ستمبر 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Syed Asad Tabish
Karamat Khan Colony, Barsi Takli
Distt: Akola - 444401 (Maharashtra)
Mob.: 8421427654

حمیرا عالیہ

ڈیجیٹل جنگل

کہانی سننا اور سنانا بچوں کی تربیت کا ایک اہم جزو ہے۔ والدین یا نانی دادی سے کہانی سننا بچوں کا پسندیدہ عمل بھی ہے۔ کیونکہ اس عمر میں بچوں کا ذہن زیادہ پختہ نہیں ہوتا لہٰذا کہانی سنانے والے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کی کہانیاں کسی غلط پیغام کی ترسیل نہ کریں۔ اس ضمن میں پنچ تنتر اور الف لیلہ کی کہانیوں کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے جن میں لطف و انبساط کے ساتھ اخلاقیات بھی شامل ہے۔ اب وقت کی رفتار کے ساتھ کہانی سنانے کا رواج بھی آہستہ آہستہ زوال پذیر ہو رہا ہے اور اس کی جگہ بچوں کے مختلف ٹی وی چینلز اور یوٹیوب ویڈیوز نے لے لی ہے۔ لیکن بچوں کی تربیت میں کہانیوں کا جو کردار ہے اس کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ بھی کم نہیں ہوئی۔

زیر نظر کتاب 'ڈیجیٹل جنگل' ایم مبین کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں شامل کہانیاں ماضی میں وقتاً فوقتاً بچوں کے مختلف رسالوں اور اخبارات کی زینت بنتی رہی ہیں۔ ان میں چمپک، لوٹ پوٹ، پراگ، مدھومسکان، پیام تعلیم، کھلونا، نور، کلیاں اور ہادی جیسے رسالے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں ہندی رسالوں میں شائع ہوئی تھیں۔ ان کہانیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام کہانیاں دلچسپ اور عام فہم انداز میں لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں مزاح اور معلومات کے ساتھ اصلاحی پہلو بھی شامل ہے۔ لیکن ایم مبین نے اپنی کہانیوں پر ناصحانہ رنگ حاوی نہیں ہونے دیا ہے جس کی وجہ سے بچوں میں اکتاہٹ کا جذبہ پیدا نہیں ہونے پاتا۔ لہٰذا وہ ان کہانیوں سے مکمل حظ اور تفریح حاصل کرسکتے ہیں۔

ایم مبین چونکہ افسانہ نگار بھی ہیں اس لیے ان کی کہانیوں میں افسانویت در آنا ناگزیر ہے۔ ان تمام کہانیوں میں افسانے کے تمام فنی لوازم یعنی ابتدا، وسط اور انتہا کے ساتھ کردار، پلاٹ اور مکالمے جیسے عناصر بھی واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ زبان و بیان سلیس ہے جس کی وجہ سے ابلاغ میں دشواری نہیں ہوتی۔ ایم مبین نے خاص خیال رکھا ہے کہ ان کی کہانیاں دلچسپ ہونے کے ساتھ تعمیری اور مقصدی بھی ہوں تاکہ بچے اس سے مثبت پیغام اخذ کریں۔

ڈیجیٹل جنگل میں موضوع کی مناسبت سے کئی سائنسی کہانیاں بھی ہیں۔ ان میں خلائی مخلوق، دوسرا سیارہ، ٹائم ٹریول، صداگر اور خلائی جہاز جیسے دیگر حیرت انگیز سائنسی ایجادات پر مبنی موضوعات شامل ہیں۔ یہ کہانیاں بچوں کو نہ صرف معلومات فراہم کرتی ہیں بلکہ سائنس اور ٹکنالوجی کے تئیں ان کے اندر شوق اور دلچسپی کو بھی فروغ دیتی ہیں۔ ایسی کہانیوں میں صداگر، خلائی سفر، خلائی جہاز میں خرابی، ڈیجیٹل جنگل اور ہوٹل 2021 وغیرہ خصوصی داد کی مستحق ہیں۔ یہ ایم مبین کا فن ہے کہ وہ ان کہانیوں کے ذریعے ایک پیغام کی ترسیل بھی کررہے ہیں اور کہانی کی دلچسپی بھی برقرار ہے۔ اس سے بچوں کے غور وفکر کرنے، سوال کرنے اور ان کے منطقی جواب کرنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ایک کہانی صداگر سے ایک منظر ملاحظہ ہو:

''جھاڑیوں میں چھپا ایلین بھی جھاڑیوں سے باہر آ گیا۔

وہ ہرے رنگ کا ایک عجیب الخلقت ایلین تھا۔ دبلا پتلا چھوٹا سر اس پر بٹن جیسی بھدی آنکھیں، چھوٹی ناک اور منہ کی جگہ دو سوراخ۔ کانوں کی جگہ سر میں دو سوراخ اور پر کسی اینٹینا کی طرح نکلے دو سرے... وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس بات کو محسوس کرتے ہی ارحم کی نظر اس کے پیروں پر گئی۔

اس کا پیر زخمی تھا اور زخم کی جگہ سے ہرے ہرے رنگ کا ایک سیال گر رہا تھا۔ ممکن تھا اس سبز مخلوق کے جسم کا خون بھی سبز ہو۔" (ص 33)

سائنس فکشن کے علاوہ مجموعے میں 'جھنگا پہلوان' کے کردار پر مبنی آٹھ یا نو کہانیاں بھی شامل ہیں۔ جھنگا پہلوان، ایم مبین کا تخلیق کردہ مزاحیہ کردار ہے جو 'چچا چھکن' اور 'بن استاد' کی طرز پر تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ کردار اتنا دلچسپ ہے کہ بچوں کے ساتھ بڑے اور سنجیدہ افراد کے چہروں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔ جھنگا پہلوان کی عجیب وغریب حرکتیں اور ان کے ساتھ پیش آنے والے پرلطف واقعات قاری کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہلکے پھلکے پر مزاح انداز میں لکھی گئی یہ کہانیاں بچوں کو ایک مکمل تفریح فراہم کرتی ہیں۔ یہ تمام کہانیاں الگ ہوتے ہوئے بھی ایک سیریز کی معلوم ہوتی ہیں۔

اس کتاب میں بہت سی کہانیاں moral stories کے زمرے میں آتی ہیں۔ ان کہانیوں کے ذریعے کہانی کار بچوں کو ایک دلچسپ واقعہ سنانے کے ساتھ اخلاقی سبق بھی دیتے ہیں۔ ان کہانیوں کے ذریعے بچوں میں اچھے کام کرنے کی چاہت پیدا ہوتی ہے اور وہ نیکی کی جانب راغب ہوتے ہیں۔ آٹے کا ڈبہ، اصلی چاندرات، رشتہ عجیب سا، کیلے کا چھلکا اور 'انعام' میں بچے پہلے پہل تو شرارت کرتے ہیں لیکن جب انھیں اپنی شرارت کی سنگینی کا علم ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کی تلافی

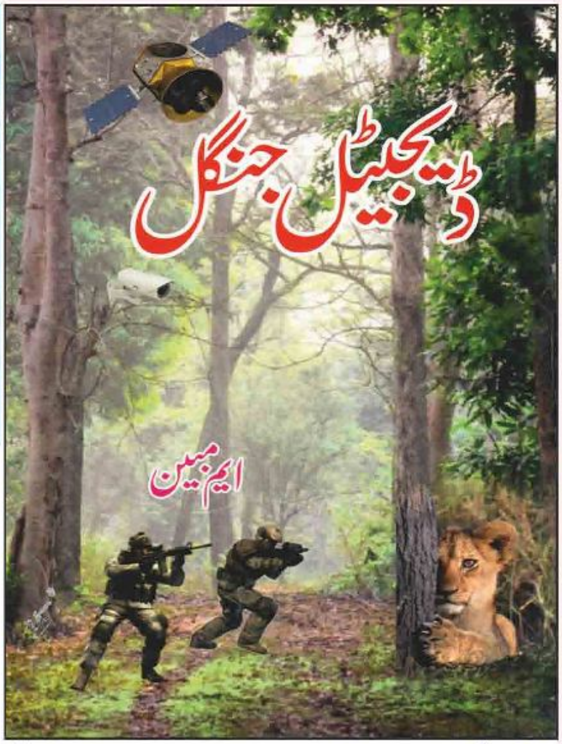

ڈیجیٹل جنگل مصنف: ایم مبین، سنہ اشاعت: 2022، ناشر: نورانی آفسیٹ پریس، مالیگاؤں، مہاراشٹر

کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح 'تالاب کہانی' میں بچوں کے کردار کے ذریعے ہی پانی کی اہمیت واضح کی گئی ہے نیز چھوٹے بچوں کے حوصلے اور استقامت کو بنیاد بنا کر ایک اہم کہانی ترتیب دی گئی ہے۔ 'گنگا میں سیلاب' کہانی بچوں کو موسمیات کے متعلق معلومات فراہم کرتی ہے اور ان کا تجسس بیدار کرتی ہے۔ اس کہانی کا دوسرا حصہ 'ایٹمی مشین' مہم جوئی اور سائنسی معلومات پر مبنی ہے۔

مجموعی حوالے سے ایم مبین کی کہانیوں کا یہ مجموعہ ادب اطفال میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

■

Humaira Aliya
Research Scholar, Dept of Urdu
Lucknow University
Lucknow - 226007

جاوید احمد سعیدی کامٹوی

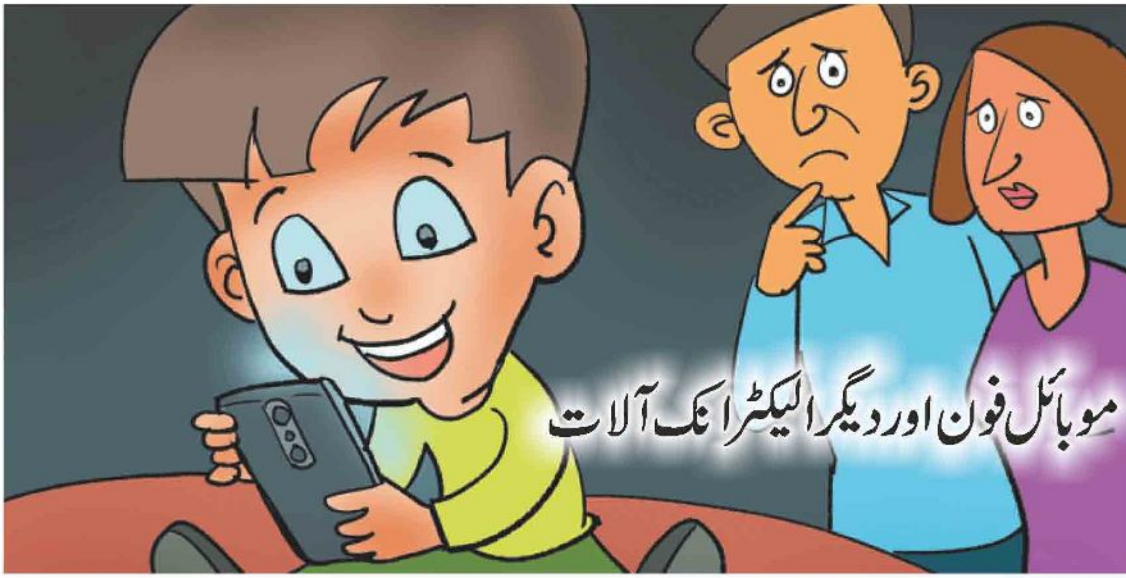

موبائل فون اور دیگر الیکٹرانک آلات

جدید طرز زندگی کی ایک بڑی برائی موبائل فون کا عام ہو جانا ہے۔ موبائل فون بذات خود کچھ نقصان دہ نہیں، یہ انسانوں کے فائدے اور آسانی کے لیے وجود میں آئے مگر ان کے غلط اور بے جا استعمال سے بہت سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

موبائل فون، کمپیوٹر، مختلف الیکٹرانک آلات انسان کو آسانیاں بہم پہنچانے کے لیے تیار کیے گئے تھے مگر ان کا ضرورت سے زیادہ استعمال نقصان پہنچا رہا ہے بلکہ مختلف آلات و مشینوں کا انسان عادی ہو چکا ہے بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کا غلام بن چکا ہے۔ ان کے بغیر آج کا انسان ایک نارمل زندگی جینے کا تصور نہیں کر سکتا۔ ضرورت کی ان چیزوں کو ہم نے اپنی عادت بنا لیا ہے۔ ان میں سب سے اہم اور عام چیز موبائل فون ہے۔ آج ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں یہ فون نظر آتا ہے چاہے وہ بڑے سے بڑا تاجر ہو، آفیسر ہو یا ایک معمولی آدمی۔ سائیکل پر سوار شخص کو بھی موبائل استعمال کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ آج دنیا میں تقریباً کروڑوں لوگوں کے پاس موبائل فون ہے۔ اتنی ہی مقدار میں انٹرنیٹ چلانے والے افراد ہیں۔ بیشک اطلاعاتی ٹکنالوجی نے دنیا کو سمیٹ دیا ہے اور گھر بیٹھے کسی سے چند منٹوں میں رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے یا کسی بھی قسم کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہے مگر ان کے غلط استعمال سے بڑے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ سروس کمپنیاں آئے دن نئے ماڈل اور زیادہ بہتر سہولیات پہنچانے کا دعویٰ کرتی ہیں اور لوگ پرانے ہینڈ سیٹ سے دست بردار ہو کر انھیں کوڑے دان میں ڈال دیتے ہیں۔ اس قسم کا کچرا جدید آلات جیسے موبائل فون، کمپیوٹر وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے اسے 'e- کچرے' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کچرے کو ٹھکانے لگانا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ انسانی صحت کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں اور آلودگی کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ترقی یافتہ اور بعض مغربی ممالک نے بڑی چالاکی سے e- کچرے کے نپٹارے کے لیے غریب ممالک کو چن لیا ہے اور وہاں ہر سال لاکھوں ٹن کچرا ڈھیر کر دیا جاتا ہے۔

موبائل کا غلط استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ گھنٹوں اس پر بات چیت چلتی رہتی ہے۔ کان اور دماغ کے پاس رہنے سے اس سے غیر مرئی شعاعیں نکلتی ہیں اور جسم میں سرایت کر جاتی ہیں۔ موبائل فون کے طویل استعمال سے بہت سے امراض

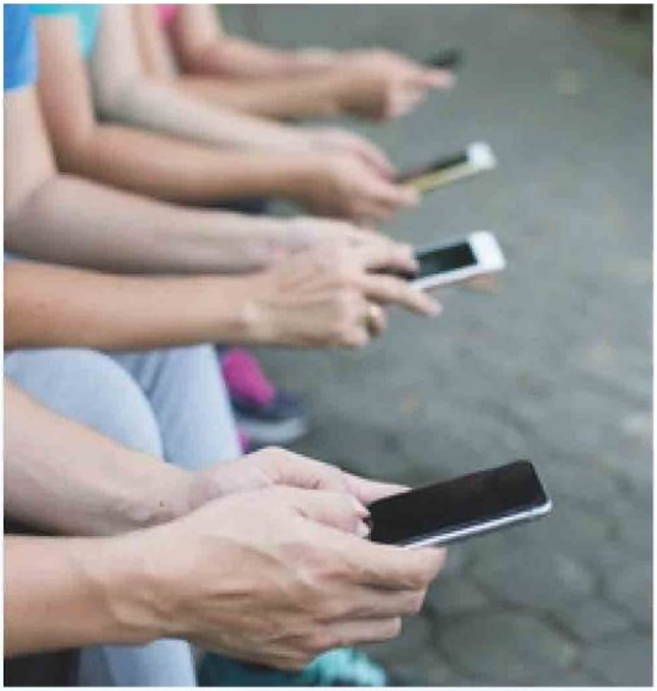

شعاعوں کے اثرات مضر ثابت ہوتے ہیں۔ حاملہ خواتین کو بھی اس کے طویل استعمال سے بچنا چاہیے۔ موبائل کے مسلسل استعمال سے اور بھی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں جیسے خارش، سماعت کی خرابی، چڑچڑاپن پیدا ہونا، بانجھ پن، بے خوابی کی شکایت، ذہنی دباؤ، سیکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت میں کمی، یادداشت کی خرابی اور دیگر جذباتی مسائل وغیرہ۔

سروس کمپنیاں اپنے گاہکوں کو موثر سروس فراہم کرنے کے چکر میں جابجا ریلے ٹاور کھڑے کر رہی ہے۔ یہ ٹاور گھنی آبادیوں میں ہیں۔ بہت سے بلڈنگ والوں نے اپنی عمارت کے اوپری حصے کو کرایہ پر دینا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح موبائل ٹاوروں میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ان ٹاوروں سے نکلنے والی شعاعیں انسانی جسم کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

حال ہی میں امریکہ اور یورپ میں کیے گئے مشاہدوں کے مطابق موبائل فون اور ٹاور سے نکلنے والی شعاعیں انسانی صحت کے لیے خطرناک ہوتی ہیں۔ جس طرح بجلی کی رو کے تاروں سے بہنے کے دوران آس پاس ایک برقی مقناطیسی میدان بن جاتا ہے۔ ایسے ہی شعاعیں موبائل ٹاور سے ہمیشہ نکلتی رہتی ہیں، اسے الیکٹرو میگنیٹک فیلڈ (CMF) کہا جاتا ہے۔ موبائل فون اور ٹاور کے علاوہ ایسی شعاعیں گھریلو الیکٹرانک آلات جیسے ٹی وی، لیپ ٹاپ، ڈیسک ٹاپ، ویکیوم کلینز، مائکروویو اوون، ہیئر ڈرائیر، ٹوسٹر، کافی میکر اور ریفریجریٹر سے نکلتی رہتی ہیں۔ اس طرح ہم دن رات ان شعاعوں کے نرغے میں ہیں۔ ایک ایکسرے ٹیکنیشین کام کے وقت مخصوص لباس استعمال کرتا ہے اور ان شعاعوں کے اثر سے خود کو محفوظ

پیدا ہوتے ہیں۔ صحت کی عالمی تنظیم (ڈبلیو ایچ او) کا ماننا ہے کہ طویل استعمال سے کینسر ہو سکتا ہے۔ اگر یومیہ 30 منٹ تک موبائل کو دس برسوں تک استعمال کیا جائے تو دماغ کے سرطان کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں سے نکلنے والی شعاعیں سر کی نسیجوں سے براہِ راست ٹکراتی ہیں جس سے ڈی این اے کو نقصان ہوتا ہے اور کینسر زدہ رسولی بن سکتی ہے۔ ان شعاعوں سے دماغ کے کیمیات بھی متاثر ہوتے ہیں اور خلیات کے ڈسٹرب ہونے سے جذباتی عوارض پیدا ہو سکتے ہیں۔ آنے والی نسل بھی اس اثر سے متاثر ہو سکتی ہے۔ صحت کی عالمی تنظیم نے بچاؤ کے طریقے سجھائے ہیں جیسے موبائل کو کانوں سے دور رکھیں، جہاں سگنل کمزور ہو وہاں موبائل استعمال کرنے سے بچیں کیونکہ سگنل کمزور رہنے سے شعاعیں مرکوز ہو جاتی ہیں اور زیادہ نقصان کا سبب بنتی ہیں۔ موبائل فون کا استعمال تھوڑی دیر کے لیے ٹھیک ہے۔ اس پر طویل گفتگو مناسب نہیں۔

بچوں کے نازک جسم پر موبائل فون اور اس سے نکلنے والی

رکھتا ہے مگر ہم ایسی کوئی احتیاطی تدبیر اختیار نہیں کرتے گویا ہر لمحہ ہر آن ان شعاعوں کی زد میں رہتے ہیں۔ شعاع پاشی کی بدولت انسان کے مختلف اعضا خصوصاً اعصابی نظام، دل، دماغ، کان وغیرہ متاثر ہوتے ہیں۔ ان شعاعوں کا سب سے برا اثر جسم کے خلیات کے ڈی۔ این۔ اے (کرموزوم) کی ساخت پر پڑتا ہے۔ اس کی دہری پٹی میں شکست وریخت کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ اس سے خلیات کی نمو میں بے قاعدگی پیدا ہوتی ہے اور یہاں سے کینسر کی شروعات ہوتی ہے۔ اگر کرموزوم کی ساخت بری طرح متاثر ہوتو اس کے اثرات آنے والے بچے کے جسم تک پہنچتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک کے مشاہدے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کینسر کے واقعات میں موبائل فون کے زیادہ استعمال سے اضافہ ہوا ہے۔ گوکہ ہمارے یہاں اس سے متعلق معلومات اکٹھا کرنے کی ذمے داری مشترکہ طور پر آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (ایمس)، انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ (آئی سی ایم آر) اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (جے این یو) کے اسکول انوائرمینٹل سائنسز کو دی گئی ہے مگر ابھی حتمی نتائج سامنے نہیں آئے ہیں۔ بعض ماہرین کی رائے میں ایسا کوئی خدشہ نہیں مگر احتیاط کرنے میں کوئی برائی نہیں اور حکومت ہند نے یہی کام کیا ہے کہ معلومات (ڈیٹا) اکٹھا کرنا شروع کردیا ہے۔ بعض دوسری بیماریوں کے بارے میں تو کوئی شک نہیں جیسے برطانیہ کی ایک ریسرچ سے یہ بات سامنے آئی کہ موبائل کے کثرت استعمال سے کان کے پاس خارش پیدا ہوتی ہے۔ یہ بیماری 'موبائل ڈرمے ٹیٹس (Dermatysis)' کہلاتی ہے۔ برٹش ایسوسی ایشن آف ڈرمیٹائٹس کے مطابق اس کی وجہ موبائل میں استعمال ہونے والی نکل (Nickel) دھات ہے۔ نکل کی اوپری سطح ہر موبائل ہینڈسیٹ پر پائی جاتی ہے جس سے کان اور اس کے آس پاس خراش پڑجاتی ہے۔ یہ حصہ سرخ ہوجاتا ہے اور آگے چل کر خارش کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ بہت سے لوگ نکل کے لیے حساس ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں اس بیماری کے چانس بڑھ جاتے ہیں۔ عام زندگی میں بھی سکوں، زیورات وغیرہ میں نکل کی آمیزش سے ایسے افراد کو پریشانی ہوتی ہے۔

اس ضمن میں جے این یو میں چوہوں پر تجربہ کیا گیا۔ ان چوہوں کو موبائل فون سے نکلنے والی شعاعوں کے میدان میں رکھا گیا۔ نتائج سے ظاہر ہوا کہ چوہوں کی تولیدی صلاحیت اور دماغ متاثر ہوئے۔ ان کے خلیات کے ڈی این اے میں تبدیل ہونے سے کینسر کے ممکنات میں اضافہ ہوا۔ نر چوہوں میں منوی حوین (نر تولیدی مادے) کم مقدار میں پیدا ہوئے یعنی بانجھ پن میں اضافہ ہوا۔ محکمۂ صحت کا یہ استدلال ہے کہ

چوہوں سے حاصل شدہ نتائج انسانوں پر منطبق نہیں کیے جاسکتے۔ مزید تصدیق کے لیے 4000 رضا کاروں کی رضامندی حاصل کی گئی ہے جو خود کو اس تجربے کے لیے پیش کریں گے۔ رضا کاروں کے 100,100 افراد پر مشتمل گروپ بنائے جائیں گے اور ان سب کے پہلے مختلف ٹسٹ کیے جائیں گے جیسے ان کا ایم آر آئی، ای سی جی، خون اور منوی حوین کی جانچ، جنسی صلاحیت وغیرہ کا ریکارڈ رکھا جائے گا۔ ان میں سے ایک گروپ کو ایک گھنٹے کے لیے، دوسرے گروپ کو دو گھنٹے کے لیے اور تیسرے گروپ کو تین گھنٹے موبائل استعمال کروایا جائے گا اور چوتھا گروپ ایسا ہوگا جسے موبائل استعمال کرنے کی قطعی اجازت نہیں ہوگی۔ اس کے بعد ان کے مذکورہ بالا ٹسٹ دوبارہ ہوں گے اور نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔

ہمارے ملک میں موبائل فون کا استعمال حال میں شروع ہوا ہے اور اس کی روشنی میں کینسر کی تشخیص بہت مشکل ہے۔ موبائل کمپنیوں کی تنظیم سیلولر آپریٹرس ایسوسی ایشن آف انڈیا (C.O.A.I) کے مطابق اس کے واقعی شواہد موجود نہیں جیسا کہ یورپی ملکوں میں پائے گئے اس لیے ان پر اتنی چیخ پکار کی ضرورت نہیں اور ہوا بنانے کی ضرورت نہیں۔ یہ موقف درست ہوسکتا ہے مگر احتیاط کرنے میں کوئی برائی نہیں۔

بہرحال کمپیوٹر، موبائل، انٹرنیٹ وغیرہ آج کی ضرورت بن چکے ہیں اور ان کے مناسب استعمال میں کوئی قباحت نہیں۔ یہ چیزیں انسان کی آسانی کے لیے ہیں اس لیے ان پر اپنا تصرف رکھا جائے نہ کہ ہم اس کے غلام بن جائیں۔

یہی حال کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال کے معاملے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ آج دنیا کی آبادی سے زیادہ netizens کی آبادی ہے یعنی ایسے لوگوں کی جو net کا استعمال کرتے ہیں۔ نئی نسل موبائل کا گھنٹوں استعمال گیم کھیلنے، ٹیکسٹ میسجنگ، پکچر دیکھنے یا نیٹ net سے محظوظ ہونے کے لیے کرتی ہے۔ یہ موبائل آنکھوں کے قریب رہتا ہے جس کے نتیجے میں غیر مرئی شعاعوں سے آنکھوں اور خلیات کو نقصان پہنچتا ہے۔ خاص طور پر دماغ کی نسیجوں کو۔ موبائل یا دیگر الیکٹرانک آلات سے نکلنے والی لہروں کو ایک حد تک جسم برداشت کرتا ہے۔ اس کو SAR یا Specific Absorption Rate کہتے ہیں۔ SAR کی شرح اگر زیادہ ہو تو اس سے جسم کو نقصان پہنچتا ہے۔ سر اور جسم کو 2 واٹ فی کیلو سے زیادہ SAR نہیں ہونا چاہیے اور 5 واٹ فی کیلو سے زائد ہونے کی صورت میں خلیات متاثر ہوتے ہیں۔ زیادہ تر ہینڈ سیٹ میں نِکل (Nickel) دھات کا استعمال ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کو نکل سے الرجی ہوتی ہے۔ کانوں کے قریب رکھنے سے وہ حصہ سرخ ہوجاتا ہے اور جلدی سوزش کا اندیشہ رہتا ہے۔ موٹر سائیکل چلانے کے دوران تو سڑکوں پر حادثات بھی ہوجاتے ہیں اس طرح موبائل فون جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ فی زمانہ موبائل فون، انٹرنیٹ کا استعمال حد سے زیادہ بڑھ چکا ہے۔ اس سے بہت سے مسائل پیدا ہورہے ہیں۔ موبائل فون تو ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں نظر آتا ہے اور تو اور بچے (خصوصاً طلبہ) اس میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتے ہیں اور اس لیے لوگوں کی صحت متاثر ہورہی ہے۔ اس کے علاوہ موبائل کے استعمال سے اور کئی نقصان ہیں۔ موبائل کے کثرت استعمال سے مختلف بیماریاں ہوتی ہیں۔ سماجی زندگی متاثر ہوتی ہے بلکہ اخلاق بھی تباہ ہوتے ہیں۔

یہ چیزیں بھی لوازم زندگی میں داخل ہوگئی ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ جب موبائل فون، کمپیوٹر، انٹرنیٹ وجود میں نہیں آئے تھے تو دنیا کا کام کس طرح چلتا تھا؟ دفتر ہو یا گھر موبائل سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔ اگر کسی سے بات چیت نہیں چل رہی ہے

تو ٹیکسٹنگ کا سلسلہ جاری ہے، ای میل بھیجا جارہا ہے۔ ایک جائزے کے مطابق یورپی ممالک کے لوگ روزانہ تقریباً اپنا نصف وقت ان آلات کے پیچھے خرچ کرتے ہیں۔ ان سے بہت سے عائلی اورسماجی مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔

انٹرنیٹ آجانے سے مصروفیات میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ تفریح کے لیے اور آرام (نیند) کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوجاتا ہے۔ گھر میں بیوی اور دوسرے افراد خصوصاً بچوں سے بات چیت کے لیے وقت نہیں ملتا۔ یہ سلسلہ خواب گاہ تک جاری رہتا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے رشتوں کو متاثر کیا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اطلاعاتی ٹکنالوجی (آئی۔ٹی) کا دھماکہ ہوگیا ہے، زندگی کے معمول میں تبدیلی آگئی ہے۔ عمر دراز لوگ، نوجوان، بچے سبھی اس کے طلسم میں گرفتار نظر آتے ہیں، مگر یہ دھیان رہے کہ کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ پر زیادہ بیٹھنے سے بہت سے شکایات پیدا ہوجاتی ہیں۔ گردن میں درد، بینائی پر اثر، انگلیوں کو حرکت دینے میں تکلیف، سوء ہاضمہ اور جسم کے مختلف حصوں جیسے کلائی، کندھے، پیٹھ اور اعصاب متاثر ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر سے مخصوص شعاعیں نکل کر آنکھوں پر اثر انداز ہوتی ہیں اور مسلسل بیٹھے رہنے سے جسم کی وضع کو نقصان پہنچتا ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق مونیٹر پر آنکھ کا جھکاؤ 17 ڈگری سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ ماؤس اور اسکرین پر نظریں جمائے رکھنے سے کرنوں کے براہِ راست آنکھوں پر پڑنے سے طویل مدت کے بعد بینائی متاثر ہوسکتی ہے۔ موبائل اور کمپیوٹر پر بار بار انگلیاں چلانے سے جوڑوں میں درد ہوسکتا ہے اور حرکت دینا دوبھر ہوجاتا ہے۔ مسلسل اسکرین کو دیکھنے کے بعد چند لمحوں کے لیے ادھر ادھر دیکھا جائے خصوصاً ہریالی کو تو آنکھوں کو اس سے راحت ملتی ہے۔ اسی طرح مسلسل بیٹھ کر کام کرنے کے دوران بیٹھنے کی پوزیشن کو بدلا جائے اور گردن کو حرکت دینے سے آرام ملتا ہے۔ غلط نشست سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ شروع میں ہاتھوں میں ہلکی سی جھنجھناہٹ ہوتی ہے یا سردی کا احساس ہوتا ہے اور انگلیاں متاثر ہونے لگتی ہیں۔ ایئر کنڈیشن ماحول میں کام کرنے سے بھی بہت سی شکایات لاحق ہوسکتی ہیں اور کمپیوٹر کے لیے اے سی کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی موبائل اور کمپیوٹر کے دوسرے نقصان ہیں۔

موبائل اور کمپیوٹر کا حد سے زیادہ استعمال وقت کے زیاں کا سبب بھی بنتا ہے۔ زبان دانی پر بھی اس کے منفی اثرات پڑتے ہیں مثلاً ایس۔ ایم۔ ایس کرتے وقت مخفف زبان کو ترجیح دی جاتی ہے اور مخصوص الفاظ کے ہجے بھی اپنی سہولت کے اعتبار سے بدل دیے جاتے ہیں۔ اس لیے نئی نسل اب لکھنے لکھانے، بیانیہ اور مطالعے سے دور ہوتی جارہی ہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہے۔ سب سے اہم یہ کہ جسمانی محنت اور ورزش کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوجاتا ہے اس سے سستی، لاپرواہی اور موٹاپا کو دعوت ملتی ہے۔

مختصراً یہ کہ فیشن کے طور پر موبائل فون، دیگر الیکٹرانک آلات کے استعمال سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسا لگ رہا ہے کہ اس پھندے سے نکلنا ناممکن ہے۔ ہفتے میں ایک دن ایسا کریں کہ ان سارے آلات سے دور رہ کر ایک فطری زندگی گزاریں تو آدمی اپنا جائزہ لے سکتا ہے اور کچھ نئی باتیں سیکھ سکتا ہے۔ کیا ایسا کرنا ممکن ہے! کوشش تو کریں۔

■

ماخذ: ہمارا طرز زندگی اور بیماریاں، **مصنف:** ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی، **سنہ اشاعت:** 2015، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کب (ن) کی آواز (م) سے بدل جاتی ہے

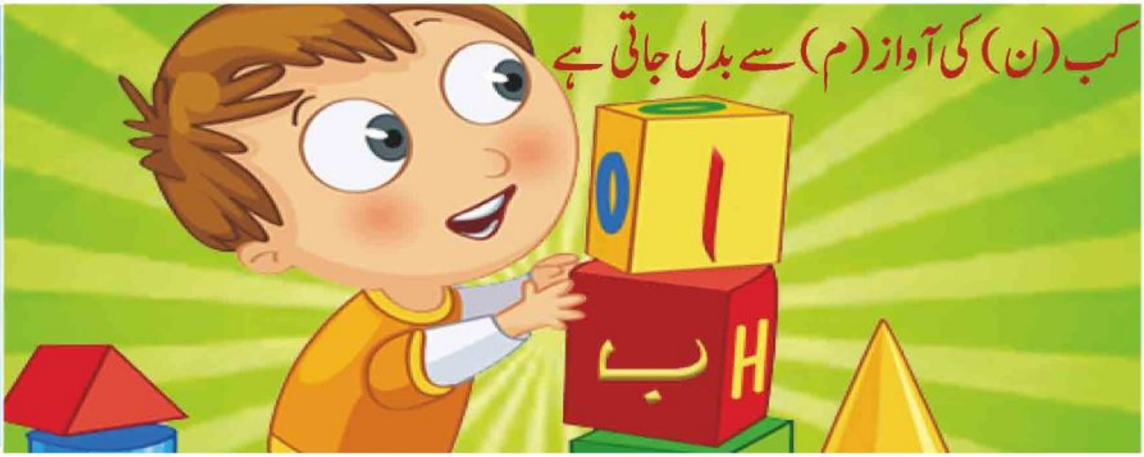

عربی و فارسی الفاظ کے درمیان اگر (ب) سے قبل (ن) ساکن ہو تو (ن) کی آواز (م) سے بدل جاتی ہے۔ یہ واضح رہے کہ اردو یا ہندی کے الفاظ جن میں (م) کی آواز نکلتی ہے ان کو (م) ہی سے لکھنا چاہیے۔

عربی یا فارسی الفاظ جن میں (ن) کی آواز (م) سے بدل جاتی ہے مع تلفظ و معنی درج ذیل ہیں:

اَنبار= اَم+بَا+ر= (ذ)= ڈھیر۔

اِنبساط= اِم+ بِ+ سَا+ط= (ذ)= خوشی، مسرت۔

اَنبوہ= اَم+ بُو+ ہ= (ذ)= مجمع، لوگوں کی بھیڑ۔

اَنبَہ= اَم+ بَہ= (ذ)= آم۔

اَنبِیَا= اَم+ بِ+ یَا= (ذ)= نبی کی جمع۔

اِنبِسَاط= اِن+ بِ+سَا+ط= (ذ)= حاصل کرنا۔

اِستَنبُول= اِس+ تَم+ بُو+ل= (ذ)= ایک شہر کا نام۔

پَنبَہ= پَم+ بَہ= (ذ)= روئی۔

تَنبُوَرہ= تَم+بوٗ+رَہ= (ذ)= ایک قسم کا باجا۔

تَنبِیہ= تَم+ بِی+ ہ= (ث)= آگاہ کرنا۔

جُنبِش= جُم + بِش= (ث)= حرکت۔

حَنبَل= حَم+ بَل= (ذ) امام احمد بن حنبل۔

حَنبَلی= حَم + بَ+ لِی= امام احمد بن حنبل کا متبع۔

دُنبَل= دُم+بَل= (ذ)= پھوڑا۔

دُنبَہ= دُم+بَہ= (ذ)= ایک جانور، (بھیڑ کی قسم کا۔

زَنبوُر= زَم+ بوٗ+ر= (ث)= بھڑ۔

زَنبِیل= زَم+ بِی+ ل= (ث) جھولی۔

سُنبُل= سُم + بُل= (ث)= ایک قسم کی بیل۔

شَنبَہ= شَم+ بَہ= (ذ)= سنیچر، ہفتہ کا دن۔

عَنبَر= عَم+بَر= (ذ)= ایک خوشبودار چیز۔

قَرنبِیق= قَ+رَم+بِی+ ق= (ذ)= عرق کشید کرنے کا آلہ۔

قَنبَر= قَم+ بَر= (ذ)= حضرت علی کا غلام۔

گُنبَد= گُم+ بَد= (ذ)= برج۔

مُزَنبِی= مُ+زَم+ بی= (ث)= مُسَمبِی= مزنبیق کا ایک پھل۔

مُزنبِیَق = مُ+زَم+ بِی+ ق= (ذ)= افریقہ کے ایک ملک کا نام۔

مِنبَر= مِم+ بَر= (ذ)= خطاب کرنے کے لیے اونچی جگہ۔

مَنبَع= مَم+بَع= (ذ)= نکلنے کی جگہ۔

■

ماخذ: صحت الفاظ، مصنف: سید بدرالحسن، **چھٹی طباعت:** 2014، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر و تقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔

'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر و تقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

—حیدر علی آتش

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

—مضطر خیر آبادی

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

—سید غلام محمد مست کلکتوی

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

—اکبر الہ آبادی

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

—علامہ اقبال

ہم نے کانٹوں کو بھی نرمی سے چھوا ہے اکثر
لوگ بے درد ہیں پھولوں کو مسل دیتے ہیں

—بسمل سعیدی

وہ لوگ جو دیوانۂ آدابِ وفا تھے
اس دور میں تو ان کی کہاں بات کرے ہے

—جاں نثار اختر

جس کو دنیا کی حقیقت کا پتہ ہوتا ہے
اس کے جینے کا سلیقہ ہی جدا ہوتا ہے

—بیدل سرحدی

معیار زندگی کو اٹھانے کے شوق نے
کردار پستیوں سے بھی نیچے گرا دیا

—حفیظ میرٹھی

ہمارے بچے بڑوں کا ادب نہیں کرتے
نہ جانے کون سا جادو نئے نصاب میں ہے

—حسیب رہبر

یہ زندگی کا سفر بھی عجیب ہی نکلا
سفر میں سب ہیں مسافر کوئی نہیں لگتا

—وسیم بریلوی

یوں تو جینے کو سبھی جیتے ہیں دنیا میں مگر
زندگی نام ہے احساس کی بیداری کا

—دوا کر راہی

فرحت بی عبدالانیس، درجہ دہم، گورنمنٹ اردو گرلس ہائرسیکنڈری اسکول
حریر پورہ برہانپور، مدھیہ پردیش

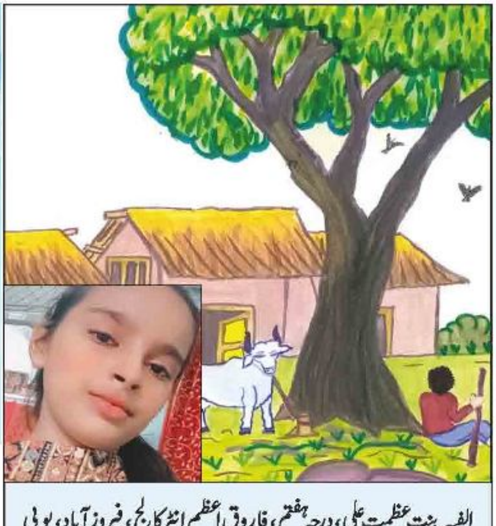

الفیہ بنت عظمت علی، درجہ ہفتم، فاروق اعظم انٹر کالج، فیروز آباد، یوپی

رمیشہ نمین محمد علیم، درجہ ہشتم، عنایتیہ ہائی اسکول ناندورہ، مہاراشٹر

خان رشدا اسماعیل، درجہ ششم، فاطمہ اردو پرائمری اسکول، اورنگ آباد

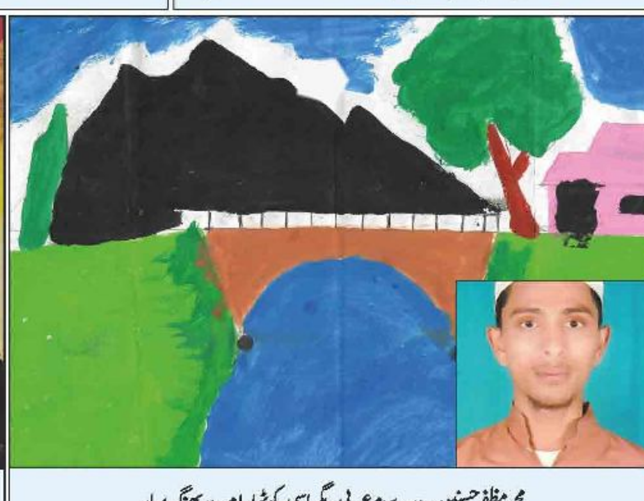

محمد مظفر حسنین، درجہ سوم عربی، بگراسی، کوٹھارام، دربھنگہ بہار

ہانیہ سحر شیخ لئیق، درجہ ششم، معین الاسلام ہائی اسکول، اورنگ آباد، مہاراشٹر

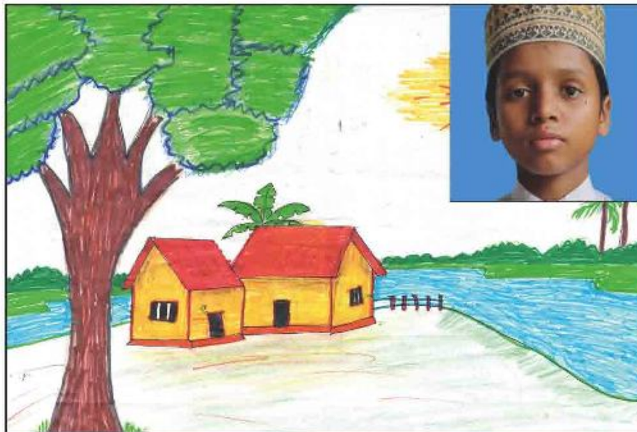

فیضان رضا، درجہ چہارم، دارالہدیٰ اسلامک اکیڈمی، بھیم پور، بربھم ضلع، مغربی بنگال

مشیرہ رحمت، درجہ ششم، لمرا ریزیڈنسی، فلیٹ نمبر 504، مرادنگر، حیدرآباد، تلنگانہ

سرفراز عالم، درجہ دوم، دارالہدیٰ اسلامک اکیڈمی، بھیم پور، بربھم ضلع، مغربی بنگال

عائشہ نوفتہ، چرپتور، ملاپورم، کیرلا

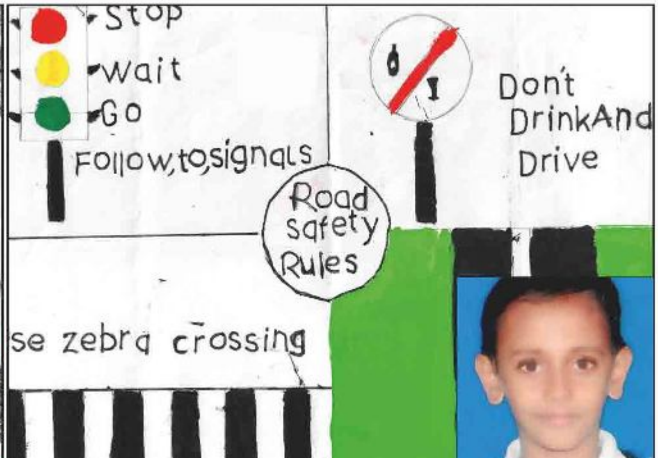

سید عرفان الحق ابن سید بدر عالم دریاپور سونگڑہ، کٹک، اڈیشہ

خدیجہ، درجہ اوّل، باسع پور، ہولی کروس، کنونٹ اسکول، بیڈ (مہاراشٹر)

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

- رسالے میں بچوں کے ادیبوں کے تعارف اور تصویر کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے والوں کو مدد مل سکے۔
- معلومات عامہ، صحت، زبان شناسی، تاریخ، تہذیب، سائنس و ٹیکنالوجی، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور اہم شخصیات سے متعلق تخلیقات ترجیحی طور پر شائع کی جائیں گی۔
- 'مستقبل کے قلمکار' عنوان کے تحت بچوں کی تحریروں کو خاص طور پر شائع کیا جائے گا۔
- بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز اور رسائل کے مدیران پر ایک سیریز شروع کی جائے گی۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक, अक्टूबर 2022, वर्ष 10, अंक 10
BACHON KI DUNIYA Monthly, October 2022 Vol. 10, Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2022-24
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/09/2022
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

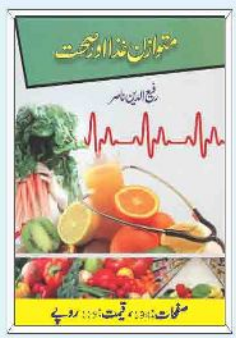

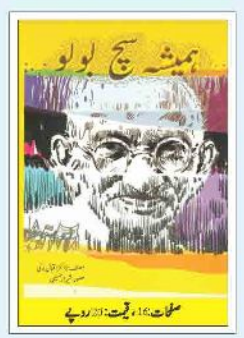

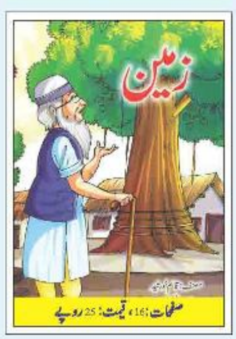

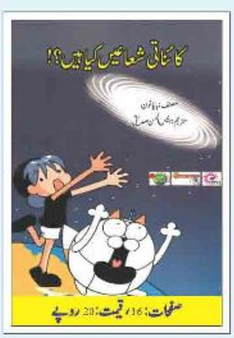

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6